

قرض بطور سامراجی ہتھیار: پاکستانی مزدور عورتوں کی زندگی

تحقیق

ROOTS
for
Equity

تعاون



2024

فہرست

III	1. تعارف
2	2. پس منظر اور صورتحال کا جائزہ
3	3. آبادی کا خاکہ (کیونٹی پروفائل)
5	4. اہم نتائج
34	5. فوکس گروپ بات چیت کے دوران سفارشات
35	6. کیس اسٹڈیز
37	7. حوالہ جات

تعارف

پاکستان میں قرض اور آئی ایم ایف سے وابستہ پالیسیوں پر یہ تحقیق روٹس فار ایکوٹی نے ایشیا پیسیفک ویمین، لائینڈ ڈیولپمنٹ (APWLD) کے تعاون سے کی ہے۔ یہ تحقیق اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح عالمی مالیاتی ادارے، خاص طور پر آئی ایم ایف، قرض کے ذریعے پاکستان کی معیشت اور ریاستی پالیسیوں پر سامراجی قابو رکھتے ہیں۔

آئی ایم ایف کے قرضے صرف پیسوں کا لین دین نہیں بلکہ ایک سیاسی اور اقتصادی ہتھیار ہیں۔ ان کے ساتھ جو شرائط آتی ہیں۔ سبسڈیز کا خاتمہ، بجلی، گیس اور ایندھن کی قیمتوں میں اضافہ، ٹیکسوں کا بوجھ عوام پر ڈالنا، سرکاری خدمات میں کٹوتی — وہ نہ صرف معیشت بلکہ عوام کی زندگیوں اور روزمرہ ضروریات پر بھی قابو پانے کا ایک طریقہ ہیں۔ یوں قرض کے بہانے عالمی مالیاتی طاقتیں پاکستان کی پالیسی سازی میں دخل اندازی کرتی ہیں، اور فیصلہ سازی عوام اور عوام کی بہتری سے ہٹ کر عالمی سرمایہ داری اور کارپوریٹ مفادات کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

یہ تحقیق خاص طور پر اس بات پر زور دیتی ہے کہ مہنگائی، بجلی و گیس کے بڑھتے بل، اور بنیادی ضروریات کی کمی کا سب سے زیادہ اثر مزدوروں، عورتوں اور محروم طبقات پر پڑتا ہے۔ جب ریاست آئی ایم ایف کی شرائط پوری کرنے کے لیے صحت، تعلیم اور سماجی خدمات پر خرچ کم کرتی ہے تو یہ خلع و عورتوں کی غیر رسمی محنت، بلا معاوضہ نگہداشت اور مزید استحصال پر مبنی مزدوری کے ذریعے پر کیا جاتا ہے۔

یہ مطالعہ اس آمرانہ بیانیے کو رد کرتا ہے جو آئی ایم ایف پروگراموں کو محض ”اقتصادی اصلاحات“ یا ناگزیر حل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض ایک سامراجی آلہ ہے، جو جمہوری فیصلہ سازی کو تباہ کرتا ہے، عوام پر مہنگائی اور بحران کے بوجھ ڈال دیتا ہے، اور معیشت کے کنٹرول کو عالمی طاقتوں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

روٹس فار ایکوٹی اور APWLD کی یہ مشترکہ تحقیق اس بات پر زور دیتی ہے کہ قرض انصاف، معاشی خود مختاری اور عوام کی فلاح کا مسئلہ ہے، اور یہ نسوانی اور عوام دوست متبادل ترقیاتی راستے پیش کرتی ہے جہاں ترقی کا مطلب مہنگائی اور غلامی نہیں بلکہ انسانیت، انصاف اور وقار زندگی ہو۔

پس منظر اور صورتحال کا جائزہ

1980 کی دہائی میں تیل کے بحران کا آغاز ہوا اور تیسری دنیا کے ممالک کو شدید مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتحال کے پیش نظر عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) نے نئی معاشی پالیسی سازی کا آغاز کیا، جس میں امریکہ کا بہت اہم اور بنیادی کردار تھا۔ اس پالیسی سازی کو اکثر واشنگٹن کانسنسز (اتفاق رائے) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پالیسیاں ان مقروض ممالک پر زبردستی مسلط کی گئیں جو آئی ایم ایف سے قرضہ لینا چاہتی تھیں۔

پاکستان بھی آئی ایم ایف کے قرضوں کا ایک بڑا وصول کنندہ رہا ہے۔ 1958 سے لیکر اب تک آئی ایم ایف کے ساتھ کیے گئے 23 معاہدوں میں سے صرف دو ہی مکمل ہوئے ہیں۔ 1980 کے بعد سے آئی ایم ایف کا پاکستان کے ساتھ کوئی کارگر تعلق نہیں رہا اور بہت سے معاہدے منسوخ کر دیے گئے۔ آئی ایم ایف کے انٹرنیشنل ایویلیو ایشن آفس (IEO) کی رپورٹ¹ کے مطابق پاکستان میں فیصلہ سازی کا عمل سیاسی اثر و رسوخ اور سیاسی مفادات کے منظور نظر ہوتے ہیں اور حکومتی جماعتیں کٹھن اقدامات سے اٹھانے سے کتراتی ہیں جس کی وجہ سے آئی ایم ایف کی عائد کردہ شرائط پر موثر انداز میں عملدرآمد نہیں ہو پاتا۔ بلاشبہ سن 2000 کے بعد سے ہر حکومت (خواہ فوجی آمریت ہو، جمہوریت ہو، یا مخلوط و مغلوب حکومتی نظام) نے اپنے حکومتی ادارے کے اختتام پر ملک کے عوامی قرضے کو تقریباً دو گنا بڑھایا ہے۔

آئی ایم ایف کی تنقید اپنی جگہ درست ضرور ہے مگر بین الاقوامی مالیاتی اداروں (IFIs) کے کردار کو بھی جانچنے کی ضرورت ہے جو جانتے بوجھتے ہر بار نااہل حکومتوں کو مسلسل بڑے قرضے دیتے رہتے ہیں جنکے قرضے واپس نہ کرنے کی بھی تاریخ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ بیرونی حوادث جیسے کہ موسمی بحران کے نتیجے میں رونما ہونے والے قدرتی آفات یا کوویڈ 19 کی وبا کی وجہ سے ہونے والے معاشی بحران، جنہوں نے پاکستان کے معاشی استحکام کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ آئی ایم ایف نے اپنی شرائط منواتے وقت ان حوادث اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بد حالی کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔

قرضے کی فراہمی بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی جانب سے ڈی ریگولیشن، نجکاری، آزاد تجارت اور معاشی استحکام جیسی معاشی اصلاحاتی پالیسیوں کو وصول کنندہ ممالک پر لاگو اور مسلط کرنے کو یقینی بنانے سے مشروط تھی۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھے بغیر کہ وہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ غربت اور بد حالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ 1980 کی دہائی سے لے کر آج تک قرض لینے والے ممالک کے لیے آئی ایم ایف کے قرضے کے پروگراموں میں معاشی اور مالیاتی پالیسیوں کی اصلاح کو لازمی اور بنیادی شرط کے طور پر شامل کیا جاتا رہا ہے، چاہے وہ ملک کتنی ہی مشکل معاشی یا سماجی صورتحال سے کیوں نہ گزر رہا ہو۔ یہ اصلاحات آئی ایم ایف کی شرائط کی بنیاد تشکیل دی جاتی ہیں۔ یہ شرائط عوامی تحریکوں خاص طور پر عورتوں کی تحریکوں کی مزاحمت کا اہم ہدف رہی ہیں۔ بلاشبہ اس کا سب سے زیادہ اثر بے زمین کسانوں، زرعی مزدوروں، شہری غریبوں اور نقل مکانی کرنے والے مزدوروں پر پڑا ہے۔

اسی خامی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تحقیق حکومت پاکستان کو آئی ایم ایف کی جانب سے گزشتہ چند دہائیوں میں دیے گئے قرضوں، اس کے مختلف پروگراموں کے ساتھ ساتھ عوام بالخصوص عورتوں پر ان قرضہ جات کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے کی گئی ہے۔ عورتیں جو کہ گھر کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ روزگار کمانے کا بھی دوہرا کردار نبھاتی ہیں، ان قرضوں کے اثرات سے سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

آبادی کا خاکہ (کیونٹی پروفائل)

یہ تحقیق شہری اور دیہی علاقوں میں کی گئی۔ شہری علاقوں کے لیے چار مقامات پاکستان کے سب سے بڑے کثیر آبادی والے شہر کراچی سے منتخب کیے گئے۔ ان مقامات میں صفورہ غازی گوٹھ، کورنگی، لاندھی اور قصبہ کالونی، کٹی پہاڑی شامل تھے۔ یہ تمام مزدور طبقے کے علاقے ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک خاص نسلی اور لسانی اہمیت ہے۔

دیہی علاقوں میں تحقیق کے لیے جنوبی سندھ کے دو اضلاع ٹنڈو محمد خان (TMK) اور بدین کا انتخاب کیا گیا۔ ٹنڈو محمد خان سے تین گاؤں اور بدین سے ایک گاؤں کو شامل کیا گیا۔

شہری مقامات

پہلا تحقیقی مقام

پہلے مقام کے لیے مشرقی کراچی² کے صفورہ ٹاؤن میں موجود صفورہ گوٹھ کا انتخاب کیا گیا جو کہ کراچی کے ایک بڑے متوسط طبقے کی آبادی والے علاقے گلشن اقبال کے قریب واقع ہے، نیز یہ جامعہ کراچی سے بھی متصل ہے۔ دراصل یہ ایک غیر رسمی کچی آبادی تھی لیکن بعد ازاں یہاں رہائشی عمارات تعمیر کی گئیں۔ تحقیق کے لیے گفتگو (انٹرویوز) اسی طرح کی ایک غیر رسمی بستی میں ہوئی جہاں کی بیشتر آبادی کا بنیادی تعلق صوبہ پنجاب کے سرانیکی بولنے والے علاقے، ضلع رحیم یار خان سے تھا۔ عام طور پر یہ پورا علاقہ بالائی سندھ، پنجاب کے سرانیکی علاقوں، اور صوبہ خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والے دیہی تارکین وطن مزدوروں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔

دوسرا تحقیقی مقام

تحقیق کے لیے دوسرا مقام ناصر کالونی، کورنگی ٹاؤن، شمالی کراچی تھا۔ کورنگی میں کورنگی صنعتی علاقہ³ واقع ہے جو کہ تقریباً دس ہزار ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس صنعتی علاقے میں ملک کے دو بڑے خام تیل کے کارخانے (آئل ریفائنریز) کے ساتھ ساتھ پانچ ہزار سے زائد صنعتی اور تجارتی اور خدمات سے متعلق ادارے موجود ہیں جو کہ روزانہ شہر کے مختلف علاقوں سے آنے والے تقریباً 15 لاکھ ہنرمند اور غیر ہنرمند مزدوروں کو روزگار فراہم کرتے ہیں۔

تیسرا تحقیقی مقام

تیسرے مقام کے لیے لاندھی نمبر 1، لاندھی، مشرقی کراچی کو منتخب کیا گیا۔ اس مزدور طبقے کے علاقے میں لاندھی صنعتی علاقہ بھی ہے جہاں متعدد درمیانہ درجہ کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی صنعتیں بھی موجود ہیں۔ ان صنعتوں میں گاڑیاں (آٹوموبائل)، کیمیائی مادے (کیمیکل)، آٹا، دواسازی اور لوہے (سٹیل) جیسی صنعتیں شامل ہیں۔

چوتھا تحقیقی مقام

تحقیق کے لیے چوتھا مقام محمد پور، کٹی پہاڑی تھا جو کہ قصبہ کالونی، مغربی کراچی کا حصہ ہے۔ یہ متوسط طبقے کے علاقے ناظم آباد کے قریب واقع ہے۔ یہ سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ ٹاؤن کا بھی حصہ ہے۔ اس علاقے میں پختون اور اردو بولنے والی آبادیوں کی اکثریت ہے جبکہ دیگر زبانیں بولنے والے جیسے کہ سندھی، ہزارہ وال، اور پنجابی بھی رہائش پزیر ہیں۔

دیہی مقامات

دیہی مقامات میں تحقیق کے لیے تین گاؤں کا انتخاب ضلع ٹنڈو محمد خان کی تحصیل ٹنڈو محمد خان سے کیا گیا۔ تینوں ہی گاؤں ایک دوسرے کے نزدیک ہی واقع ہیں۔ جن میں سے دو مسلمان گاؤں حضور بخش لاشاری اور مولابخش لاشاری تھے جبکہ تیسرا گاؤں ایک ہندو گاؤں ویری گوٹھ تھا جہاں کی آبادی کوہلی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ چوتھے فوکس گروپ کے لیے سیل گام گاؤں کو چنا گیا جو کہ ضلع ٹنڈو محمد خان سے ملحقہ ضلع بدین میں موجود ہے۔ یہ بھی ایک ہندو گاؤں ہے جس کی آبادی بھیل ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ بھیل اور کوہلی دونوں ہی ذاتوں کا پیشہ ورانہ تعلق زراعت سے ہے۔ مسلمان گاؤں میں عورتوں کے شوہر (جو کہ گھرانہ کے سربراہ بھی تصور کیے جاتے ہیں) ایک سے پانچ ایکڑ تک کی زمین کی ملکیت رکھتے تھے۔ جبکہ ہندو بے زمین مزارع تھے جو کہ مسلمانوں کی طرح وڈیروں یا جاگیرداروں کی زمین پر مزدوری کرتے تھے۔ فرق یہ ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے گاؤں کے قریب ہی دوسروں کی زمین پر کام کرتی تھیں جہاں وہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھیں، جبکہ ہندو خاندان جہاں کام ملتا تھا وہاں چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات انہیں ضرورت پڑنے پر کئی کئی دنوں تک کے لیے بھی نقل مکانی کرنی پڑ جاتی تھی۔ بدین اور ٹنڈو محمد خان دونوں جنوبی سندھ کا حصہ ہیں جہاں مسلمان جاگیردار خاندانوں کا اثر و رسوخ ہے۔

اہم نتائج

سینڈری تحقیق

اس تحقیق کا مقصد پاکستان کے صوبہ سندھ میں عورتوں کی زندگیوں پر ماضی اور حال میں قرضہ جات اور اس سے جڑے دیگر سیاسی، سماجی، اور ماحولیاتی بحرانوں کے اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ بالخصوص بنیادی سہولیات کی معیاری فراہمی جیسے کہ صحت، تعلیم، خوراک اور غذا، رہائش، پانی اور نکاسی آب، سماجی تحفظ، گھریلو قرضہ، مناسب روزگار بشمول زرعی پیداوار اور دیکھ بھال کی ذمہ داریوں اور فرائض تک رسائی اور دستیابی پر اثرات کا مطالعہ کرنا شامل ہے۔

مہنگائی نے ان تمام علاقوں کے ہر گھر اور ہر فرد کو بہت بری طرح متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے نقل و حمل، گھریلو اخراجات، توانائی، بجلی، گیس، تعلیم، صحت، خوراک اور پانی کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ مزید برآں بڑھتے ہوئے معاشی بحران، روزمرہ کے اخراجات میں مسلسل اضافہ، گھریلو آمدنی کا جھوٹ (نہ بڑھنا)، غیر فعال فیٹریاں اور کارخانے، زیادہ سود پر قرضے، اور حکومتی محصولات (ٹیکس) کی زیادتی نے ان علاقوں کی عورتوں کو مزید غیر محفوظ بنادیا ہے جس کی وجہ سے انہیں بڑھتے ہوئے کام کے بوجھ، ذمہ داریوں میں اضافے، ذہنی دباؤ، ڈپریشن، اضطراب، بے چینی سمیت دیگر ذہنی بیماریوں و مسائل کا سامنا ہے۔

عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) کی شرائط اور نیولبرل پالیسی ایڈجسٹمنٹ

پاکستان گزشتہ دو دہائیوں سے سیاسی اور معاشی اتار چڑھاؤ کا شکار رہا ہے۔ یہ دہائیاں ملکی حکمرانی کے حوالے سے دو ادوار پر مشتمل ہیں۔ 2001 سے اگست 2008 تک جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں فوجی حکومت کا دور اور دوسرا اس کے بعد آنے والی دو بظاہر کامیاب نام نہاد جمہوری حکومتیں۔ جس میں سے ایک صدر آصف علی زرداری کی قیادت میں پیپلز پارٹی کی حکومت اور پھر وزیراعظم نواز شریف کی قیادت میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت۔

11 ستمبر 2001 کو امریکہ پر ہونے والے حملہ کے بعد پاکستان کو نام نہاد "دہشتگردی کے خلاف جنگ" میں زبردستی شامل ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد آرمی پبلک اسکول، پشاور پر حملہ کے بعد 2014 سے 2017 کے درمیان ملک کے شمال مغربی حصے میں متعدد فوجی آپریشنز کیے گئے۔ اسی دورانیہ میں 2010 میں پاکستان نے اپنی تاریخ کا بدترین سیلاب بھی دیکھا اور اس کے بعد 2022 میں بھی پاکستان ایک اور تباہ کن سیلاب سے دوچار ہوا۔ اس کے علاوہ 2020 اور 2021 کے دوران کورونا کی وبا ایک علیحدہ سانحہ ہے جس نے ملکی صورتحال کو مزید سنگین کر دیا۔

جنرل مشرف نے اکتوبر 1999 میں وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ کر ان کو برطرف کر کے اقتدار پر خود جبری قبضہ کر لیا۔ یہ اس وقت ہوا جب محض ایک ماہ قبل آئی ایم ایف نے معاشی وعدوں پر عمل نہ کرنے پر ملک کو مزید قرضے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت ملک کا کل عوامی قرضہ مجموعی قومی پیداوار (گر اس ڈومیسٹک پروڈکٹ / جی ڈی پی) کے 90 فیصد سے زائد تھا۔ 1998 میں کیے گئے ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے

امریکہ کی قیادت میں معاشی پابندیاں لگائی گئیں تھیں جس سے ادائیگیوں کے توازن (بیلنس آف پیمنٹ) کا بحران پیدا ہو گیا تھا۔ جنرل مشرف نے آئی ایم ایف کے ساتھ تعلقات بحال کیے اور کئی سالوں کی عدم تعمیل کے بعد اسٹینڈ بائی معاہدے (SBA) کو مکمل طور پر نافذ کیا گیا۔ آئی ایم ایف کی جانب سے مسلط کی گئی ڈھانچہ جاتی اصلاحات (اسٹرکچرل ریفرمز) میں درج ذیل نکات شامل تھے⁴:

(i) محصولات (ٹیکس) اور تجارتی اصلاحات

(ii) سرکاری اداروں کی اصلاحات اور نجکاری

(iii) مالیاتی شعبے کی اصلاحات اور

(iv) شفافیت، حکمرانی اور سرکاری مالیاتی انتظام اور جوابدہی

مذکورہ بالا وعدوں کی بنیاد پر حکومت نے معاشی پالیسی اصلاحات نافذ کیں جن میں سرکاری اداروں کی نجکاری بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ منڈی کی بنیاد پر تنظیمی ادارے (ریگولیٹری باڈیز) قائم کی گئے جیسے کہ آئل اینڈ گیس ریگولیٹری باڈی⁵۔ تیل و گیس، بینک، مواصلات، اور توانائی کے شعبوں میں سرکاری اداروں کی بڑے پیمانے پر نجکاری کی گئی۔ مزید برآں مالیاتی خدمات کے شعبے کی بھی نجکاری ہوئی جس میں بڑے تجارتی بینکوں (حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک اور الائیڈ بینک) کو نجی شعبے کے حوالے کر دیا گیا۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو بھی خود مختاری دے دی گئی۔

مالیاتی پالیسی کی تبدیلیوں میں شامل تھے "۔۔۔ آمدنی برائے محصولات (ٹیکس ریونیو) میں اضافہ، اخراجات میں کمی، مراعات میں کٹوتیاں"۔

اس کے علاوہ محصولات کی اصلاحات، محصولات کی بنیاد اور آمدنی میں اضافے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے جن میں انتظامی اقدامات شامل تھے، جیسے کہ محصولات کے انتظامی امور کو سادہ بنانا، محصول وصول کنندگان اور دہندگان کے مابین براہ راست رابطہ ختم کرنے کے ذریعے بدعنوانی کو ختم کرنا، کے ساتھ ساتھ خود کار محصولات وصولی کے نظام کو فروغ دینا۔ تاہم آئی ایم ایف کی شرائط پر عملدرآمد ہونے کے باوجود بھی ملک کے قرضوں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی۔ 2000 سے 2008 تک کے عرصے میں پاکستان کا کل سرکاری قرضہ 6.1 کھرب روپے تک جا پہنچا، جو کہ آٹھ سالہ دورانیہ میں سو فیصد اضافہ تھا۔

ملک ایک بار پھر بڑے معاشی مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر ختم ہو چکے تھے۔ اس صورتحال میں ایک بار پھر عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) کے اسٹینڈ بائی معاہدے کے تحت قرضہ حاصل کیا گیا۔ مجموعی طور پر 3.1 ارب امریکی ڈالر کے قرضے کی منظوری دی گئی جس کے ساتھ متعدد شرائط وابستہ تھیں۔ یہ شرائط پچھلی شرائط سے زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شرائط نمایاں تھیں⁶:

"۔۔۔ مالیاتی خسارے میں کمی، مالیاتی پالیسیوں میں مزید سختی، بینکاری قوانین میں ترامیم تاکہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو بینکاری

نگرانی کے اختیارات میں موثر بنایا جاسکے، جنرل سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے نظام کو ہم آہنگ کرنا۔"

ڈھانچہ جاتی (اسٹرکچرل) اصلاحات کا سب سے اہم حصہ توانائی کی مراعات کو ختم کرنا تھا۔ تاہم حکومت خاص طور پر توانائی کے شعبے کی اصلاحات

کے حوالے سے آئی ایم ایف کی شرائط پر پورا نہ اتر سکی جس کی وجہ سے معاہدہ مکمل نہ ہو سکا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ بجلی (توانائی) کے شعبہ کی نجکاری پاکستان کی معاشی بد حالی اور جمود کا ایک اہم ترین محرک رہی ہے۔ اس شعبے کو پہلی بار 1998 میں نجی ملکیت میں دیا گیا تھا، اور بعد ازاں جنرل پرویز مشرف کے آمریتی دور میں بھی اس شعبے کی نجکاری کی گئی۔ جیسا کہ دیگر مقامات پر بھی ذکر ہوا ہے کہ پاکستان میں پالیسی اقدامات ان نکات پر مبنی ہوتے ہیں⁷:

"۔۔۔ قرض دہندگان (ڈونر ایجنسیز) / بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر بین الاقوامی اداروں کے مفادات اور / یا کردار کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ 1980 کی دہائی کے اواخر اور 1990 کی دہائی کے آغاز میں یہ ادارے نئے بجلی گھر (پاور پلانٹس) کی تعمیر کے لیے قرضے دینے کے لیے زیادہ سرگرم تھے۔ اس کا واضح ثبوت HUBCO کی ترقی و تعمیر میں عالمی بینک کی معاونت ہے۔ بعد میں انہوں نے حکومتوں کو سرکاری اداروں کی نجکاری پر زور دیا۔ بین الاقوامی اداروں کی جانب سے ہی نجی سرمایہ کاروں کو اس بات پر راغب کیا گیا کہ وہ ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری کریں۔ پاکستان میں بجلی کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے سرکاری شعبے میں مالیات (فنڈز) کی کمی نے نجی سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کا سنہری موقع فراہم کیا۔"

2008 سے 2013 کے دوران پاکستان کا مجموعی عوامی قرضہ مزید بڑھ کر 14.3 کھرب روپے (یعنی 51 ارب امریکی ڈالر)⁸ ہو گیا جو کہ پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کے اقتدار سنبھالنے کے بعد کے پانچ سالوں میں 130 فیصد اضافہ تھا۔ 2013 میں عالمی مالیاتی ادارے (آئی ایم ایف) کے ساتھ حکومت پاکستان ایک نئے معاہدے میں گئی جس میں درج ذیل اہم ترین نکات⁹ پر اتفاق ہوا:

1. بہت بڑا مالی خسارہ، جو اب مزید مالی اعانت کے قابل نہ رہا تھا؛

2. بین الاقوامی ذخائر (international reserves) کی انتہائی کم سطح؛ اور

3. ڈھانچہ جاتی (اسٹرکچرل) اصلاحات کی ضرورت — خاص طور پر توانائی کے شعبے میں — تاکہ ملکی معیشت کو شرح نمو کی چلی سطح کے دلدل سے نکالا جاسکے جس میں وہ برسوں سے پھنسی ہوئی ہے۔ اس معاہدے کا مقصد مالی خسارے کو تین سال میں جی ڈی پی کے 8 فیصد سے کم کر کے تقریباً 3.5 فیصد تک لانا تھا۔

آئی ایم ایف قرض کی شرائط میں مالیاتی استحکام، ٹیکس اصلاحات، توانائی کے بحران سے نمٹنے کے اقدامات، سرکاری اداروں کی تنظیم نو اور نجکاری، تجارتی پالیسی میں اصلاحات، اور سرمایہ کاری کے ماحول کو بہتر بنانے کے اقدامات شامل تھے۔ ان پالیسیوں سے توقع یہ کی گئی تھی کہ ٹیکس کا دائرہ وسیع کیا جائے گا، امیر طبقہ کو دی جانے والی مراعات کو کم کیا جائے گا، جبکہ کم آمدنی والے صارفین کے لیے قیمتیں برقرار رکھی جائیں گی۔

2013 کے آئی ایم ایف معاہدے سے لے کر گزشتہ دو دہائیوں تک، آئی ایم ایف کی تجویز کردہ پالیسی اصلاحات تقریباً ایک جیسی رہیں ہیں لیکن ان کے کوئی موثر نتائج نہیں نکلے۔ پالیسی خود ہی اپنے مرکز سے بھٹکی ہوئی تھی کیونکہ کل ٹیکس آمدنی میں براہ راست ٹیکس کا حصہ 40 فیصد سے بھی

کم تھا، جبکہ باقی 60 فیصد بالواسطہ ٹیکس پر مشتمل تھا، جن میں سیلز ٹیکس سرفہرست تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹیکس کا بوجھ زیادہ تر نچلے معاشی طبقات پر پڑ رہا تھا کیونکہ 92 فیصد آبادی ٹیکس کے لیے مقرر کردہ کم از کم آمدنی کی حد سے نیچے زندگی گزار رہی تھی۔¹⁰ مزید یہ کہ ٹیکس کا ہدف صنعتی شعبے پر زیادہ تھا حالانکہ یہ شعبہ جی ڈی پی میں صرف 20 فیصد ہی حصہ ڈالتا ہے لیکن کل وصول شدہ ٹیکس کا 60 فیصد ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس زرعی شعبہ جو کہ جی ڈی پی کا 21 فیصد حصہ فراہم کرتا ہے، صرف 2.5 فیصد ٹیکس ادا کرتا ہے۔¹¹

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نیم جاگیر دارانہ اور نیم نوآبادیاتی نوعیت کی معیشت نے جاگیر دار طبقے پر ٹیکس عائد ہی نہیں ہونے دیا۔ وزارت خوراک و زراعت کے مطابق قیام پاکستان کے فوراً بعد صرف 7 فیصد زمینداروں کے پاس 53 فیصد زمین تھی۔ لیکن اب یہ بدترین صورت اختیار کر چکی ہے۔ حکومت پاکستان کی وزارت منصوبہ بندی، ترقی و اصلاحات کے منصوبہ بندی کمیشن کی جانب سے پیش کردہ گیارہواں پانچ سالہ منصوبہ 2013-2018 کے مطابق:

"پاکستان میں زرعی زمین کی تقسیم نہایت غیر مساوی ہے، کیونکہ صرف پانچ فیصد زرعی گھرانے (جاگیر دار خاندان) ملک کی 64 فیصد زرعی زمین کے مالک ہیں۔ اس کے برعکس 80 فیصد سے زائد کسانوں کے پاس پانچ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے، جبکہ عورتوں کی زمین کی ملکیت میں شراکت دو فیصد سے بھی کم ہے۔"

یہ اعداد و شمار اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ایک مخصوص زمیندار / جاگیر دار طبقہ ہی محفوظ ہے جبکہ باقی پورا سماج خاص طور پر محنت کش عوام بھوک اور غربت کی ذلالت برداشت کرنے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت کہ ریاست ملک کے بااثر جاگیر دار طبقے کو ہی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ مزید یہ کہ ریاست کی جانب سے زرعی مراعات دینے کا مقصد بھی انہیں جاگیر داروں اور بڑے زمینداروں کو فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے۔ 2015 میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے 341 ارب روپے کا کسان پیسج کا اعلان کیا۔ اس پیسج میں زرعی مشینری پر عائد ٹیکس 45 فیصد سے کم کر کے 9 فیصد کر دیا گیا، اور کولڈ چین مشینری (cold chain machinery) پر سیلز ٹیکس 17 فیصد سے کم کر کے 7 فیصد کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ 12.5 ایکڑ سے کم زمین والے چھوٹے کسانوں کے لیے ٹیکس میں چھوٹ اور بناسود کے قرضے فراہم کیے گئے۔ لیکن جیسا کہ خود مضمون میں کہا گیا ہے کہ "پاکستان میں زرعی مراعات کا مجموعی ڈھانچہ نہ تو عدم مساوات کو کم کرنے میں مؤثر ہے اور نہ ہی غریب کسانوں کی معاونت کرتا ہے۔"¹³ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے دورِ حکومت کے اختتام تک، یعنی 2013 سے مئی 2018 تک، سرکاری قرضہ بڑھ کر 25 کھرب روپے (89.4 ارب امریکی ڈالر)¹⁴ تک پہنچ گیا تھا جو کہ 76 فیصد اضافہ تھا۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آئی ایم ایف کے پچھلے معاہدے کے تحت کی گئی مالیاتی اصلاحات کوئی سودمند نتائج فراہم نہ کر سکیں۔

سابقہ حکومتوں پر آئی ایم ایف سے قرض لینے اور اس کی شرائط تسلیم کرنے پر تنقید کا نشانہ بنانے والی پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کی حکومت نے 2019 میں خود بھی عالمی مالیاتی ادارے (آئی ایم ایف) کے ساتھ ایک نئے ایکسٹینڈڈ فنڈ فیسیلیٹی (Extended Fund Facility / EFF) نامی معاہدہ کیا۔ اس نئے معاہدے کے تحت چھ ارب امریکی ڈالر کا قرضہ حاصل کیا گیا۔ پی ٹی آئی حکومت نے اقتدار سنبھالنے سے پہلے وعدہ یہ

کیا تھا کہ قرضوں کا بوجھ کم کر کے اسے 20 کھرب روپے (یعنی 71 ارب امریکی ڈالر)¹⁵ تک لایا جائے گا، لیکن اس کے برعکس تحریک انصاف کی حکومت نے اپنے 43 ماہ کے دورِ اقتدار میں قومی قرضہ کو بڑھا کر 44.3 کھرب روپے (یعنی 158 ارب امریکی ڈالر)¹⁶ تک پہنچا دیا۔ یعنی صرف چار سال سے بھی کم دور حکومت میں ملکی قرضہ میں 19.3 کھرب روپے (69 ارب امریکی ڈالر)¹⁷ یا 77 فیصد کا اضافہ ہوا۔ پاکستان کا کل مجموعی قرضہ بڑھ کر 60 کھرب روپے (214 ارب امریکی ڈالر)¹⁸ تک ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ پاکستان نے اپنے قیام کے 75 ویں سال میں گزشتہ 74 برسوں میں لیے گئے مجموعی قرضے کا ایک چوتھائی یعنی 12 کھرب روپے (42 ارب امریکی ڈالر)¹⁹ صرف ایک ہی سال وصول کیا۔

اس نئے آئی ایم ایف معاہدے کے تحت جو شرائط عائد کی گئیں ان میں آزاد منڈی کے مطابق کرنسی کی قیمت طے کرنا، گیس اور بجلی کی قیمتوں میں اضافہ، روپے کی قدر میں مزید کمی، اور شرح سود میں اضافہ شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی مالیاتی ادارے کی جانب سے پاکستان پر یہ بھی دباؤ ڈالا گیا کہ وہ چین، سعودی عرب، اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک سے 2010 ارب امریکی ڈالر تک کا قرضہ کم از کم ایک سال تک کے لیے اپنے پاس رکھوائے۔²⁰ اس وقت چین اور پاکستان کی گہری اقتصادی شراکت داری کی وجہ سے بھی عالمی سیاسی عوامل پاکستان کی معیشت پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ امریکا نے اس خدشہ کا بھی اظہار کیا تھا کہ آئی ایم ایف سے حاصل کردہ قرضہ کہیں چین کے واجب الادا قرضوں کی ادائیگی کے لیے استعمال نہ کیے جائیں۔²¹ عالمی مالیاتی ادارہ کی جانب سے دیئے جانے والے قرضے کی شرائط پچھلی شرائط سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھیں جن میں درج ذیل نکات قابل ذکر تھے:²²

- ایک فیصلہ کن مالیاتی استحکام جس کا مقصد 39 ماہ کے معاہدے کی مدت کے دوران میں وفاقی اور صوبائی سطح پر اضافی محصولات کے ذریعے عوامی قرض کو کم کرنا اور معیشت کو مضبوط بنانا تھا تاکہ مجموعی قومی پیداوار (جی ڈی پی) کے 4 سے 5 فیصد کے برابر آمدنی میں اضافہ کیا جاسکے؛
- سماجی اخراجات میں توسیع جس میں پسماندہ ترین طبقات کی مدد کے لیے سیفٹی نیٹس (سماجی تحفظ) کو مضبوط اور وسیع کرنا؛
- ایک با آسانی قابل تبدیل اور منڈی کی بنیاد پر طے کردہ شرح تبادلہ تاکہ عالمی مسابقت کو بحال کیا جاسکے، زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہو، اور بیرونی جھٹکوں (ناگہانی آفات) کی صورت میں بچاؤ کی گنجائش پیدا کی جاسکے۔ اس نظام کو ایک مناسب مالیاتی پالیسی کے ذریعے سہارا دیا جانا تھا جو مہنگائی کو قابو میں رکھنے اور اعتماد بحال کرنے میں معاون ہو، اور اسے ایک خود مختار اسٹیٹ بینک کے ذریعے چلائے جانا ممکن ہو؛
- توانائی کے شعبے میں اصلاحات تاکہ نیم مالیاتی خسارے (quasi-fiscal losses) ختم کیے جاسکیں اور سرمایہ کاری کو فروغ دیا جاسکے جس کے لیے گیس اور بجلی کے نرخوں کے تعین کو غیر سیاسی (حکومتی عمل دخل سے مبرا) کرنا، اور معاہدے کی مدت کے دوران نرخوں کو بتدریج اس سطح پر لایا جانا تھا جہاں لاگت کی مکمل وصولی ممکن ہو سکے؛ اور اس کے ساتھ ہی؛
- ڈھانچہ جاتی اصلاحات (structural reforms) جن میں اداروں کو مضبوط بنانا، حکمرانی اور شفافیت میں اضافہ کرنا اور سرمایہ کاری کے لیے سازگار ماحول ترتیب دینا تاکہ پیداواری صلاحیت میں بہتری کے ساتھ ساتھ پائیدار ترقی اور دیرپا اصلاحات کو یقینی بنایا جاسکے جو اور مستحکم ترقی کی ضمانت ہو، شامل ہے۔

پچھلی دفعہ سے اب کی بار بھی شرائط میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کی حکومت 2022 میں برطرف کر دی گئی اور پھر پاکستان مسلم لیگ (ن) ایک مختصر مدت کے لیے اقتدار میں آئی۔ اگست 2022 میں ایک نگران حکومت قائم ہوئی تاکہ اگلے انتخابات کروائے جاسکیں۔ اس وقت پاکستان شدید معاشی مشکلات سے دوچار تھا۔ جولائی 2022 میں سبکدوش ہونے والی مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے ایک بار پھر آئی ایم ایف کے ساتھ 9 ماہ کا قلیل مدتی بیل آؤٹ معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی شرائط²³ بھی پچھلی شرائط سے بالکل بھی مختلف نہ تھیں اور ان میں بھی پچھلی شرائط کا ہی عکس نظر آتا ہے جیسے کہ آزاد منڈی پر مبنی شرح تبادلہ کی پالیسی کا تسلسل، محصولات وصولی کے ذریعے آمدنی میں اضافہ اور توانائی کے شعبے میں قیمتوں میں مزید اضافہ۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت پاکستان کو آئی ایم ایف کے مالیاتی اہداف پورے کرنے کے لیے 1.34 ارب امریکی ڈالر سے زائد کے نئے ٹیکس لگانے کا پابند کیا گیا تھا۔²⁴ قیمتوں میں اضافے کی دیگر مثالوں کے علاوہ قابل فکر اضافہ یہ تھا کہ حکومت پنجاب نے پانچ بڑے شہروں کے لیے پانی کے بلوں میں 400 فیصد اضافے کی منظوری بھی دی تھی۔²⁵

تکنیکی طور پر پاکستان ڈیفالٹ کر چکا تھا کیونکہ وہ چین، سعودی عرب یا متحدہ عرب امارات سے لیے گئے قرضے واپس کرنے سے قاصر رہا۔ یہ قرضے ہر سال مؤخر (roll over) کیے جاتے رہے۔ جبکہ نسل در نسل منتقل ہونے والے قرضوں اور بیل آؤٹ معاہدوں نے عالمی مالیاتی ادارہ کو پاکستان کی ترقی اور معیشت پر غیر معمولی اختیار دے دیا تھا۔ معیشت پر عائد کیے گئے سخت اقتصادی پابندیوں نے ملک کی ترقی اور خود مختاری کو بھی متاثر کیا ہے۔ آئی ایم ایف کی شرائط میں آزاد تجارت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ پاکستان آئی ایم ایف سے نیا معاہدہ طے کرنے سے قبل لازماً دیگر مالیاتی دہندگان (ڈونرز) سے خطیر رقم کا بندوبست کرے۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے پاکستان نے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے 3 ارب امریکی ڈالر حاصل کیے، جبکہ چین نے اپنے 2.4 ارب امریکی ڈالر قرضہ اگلے دو سال کے لیے مؤخر کیے۔²⁶

بہر حال اس معاہدے کو حاصل کرنے کے لیے پاکستان کو ایک بھاری قیمت بھی چکانی پڑی۔ وہ یہ کہ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اپنی حکومت تحلیل ہونے سے عین قبل 200 سے زائد معاہدوں کو قانونی شکل دے دی۔ سبکدوش ہونے والے وزیراعظم نے چیف آف آرمی اسٹاف (COAS) کے ہمراہ ایک نئی "ون ونڈو" تجارتی سہولت، اسپیشل انویسٹمنٹ فسیلیٹیشن کونسل (SIFC) کا آغاز کیا۔ اس کونسل کی توجہ پانچ کلیدی شعبوں دفاع، زراعت، معدنیات، معلومات اور رابطہ عامہ (انفارمیشن ٹیکنالوجی و ٹیلی کمیونیکیشن)، اور توانائی پر مرکوز ہوگی۔ اس نئی تنظیم ایس آئی ایف سی کے ذریعے ملک میں 40 سے 50 ارب امریکی ڈالر تک کی نئی سرمایہ کاری آنے کی توقعات ہیں۔²⁷ معاہدے کے ایک حصے کے طور پر لینڈ انفارمیشن اینڈ مینجمنٹ سسٹم، سینٹر آف ایکسیلنس (LIMS-CoE) کے تحت "گرین انیشی ایٹو" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت نو ملین ہیکٹر سے زائد غیر آباد (نا قابل کاشت) زمین پر جدید زرعی فارمز کے لیے کثیرالملکی کمپنیوں کے ساتھ مشترکہ منصوبے (Joint Ventures) شروع کرنے کے لیے زمین لی جائیگی۔ سعودی عرب نے اس منصوبے پر اعلیٰ کارکردگی والے آبپاشی نظام کو نافذ کرنے کے لیے ابتدائی طور پر 500 ملین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ خلیجی ممالک سے مزید سرمایہ کاری متوقع ہے۔²⁸

ملک میں تجارت اور سرمایہ کاری پر عسکری ادارے کی بالادستی بذاتِ خود جمہوری فیصلوں کے عمل کے لیے ایک خطرہ ہے جبکہ ملک پہلے ہی آئی ایم ایف کی آمریت کے تابع ہے جس نے خود مختار معاشی پالیسی کی گنجائش بہت محدود کر دی ہے۔ مذکورہ بالا حقیقتوں کے علاوہ دیگر رپورٹس کے

مطابق پاکستان کو (ISDS) Investor-State Dispute Settlement کے کئی کمیزز کا بھی سامنا ہے۔ 2019 میں انٹرنیشنل سینٹر فار سیٹلمنٹ آف انویسٹمنٹ ڈسپیوٹس (ICSID) کے ٹریبونل نے آسٹریلوی مائننگ کمپنی Tethyan Copper Company کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے ریاست پاکستان پر 5.8 ارب امریکی ڈالر کا جرمانہ عائد کر دیا تھا۔²⁹ قبل ازیں پی ٹی آئی کے دور حکومت میں پاکستان نے اپنے 48 میں سے 23 دوطرفہ سرمایہ کاری معاہدوں (BITs) کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تاہم، نگران حکومت کے دوران جنوری 2024 میں اس فیصلے کو واپس لیتے ہوئے معاہدوں کو بحال کر دیا۔ آسٹرلیین فیئر ٹریڈ اینڈ انویسٹمنٹ نیٹ ورک (AFTINET) کے مطابق:³⁰

"پاکستان نے خلیجی تعاون کونسل (گلف کو آپریشن کونسل / جی سی سی) کے ساتھ تجارتی معاہدے میں ISDS (Investor-State Dispute Settlement) کو شامل کرنے کے لیے سعودی عرب اور قطر کے دباؤ کے بعد ISDS دعوؤں کو نمٹانے کے لیے ایک "تدریجی حکمت عملی" (graduated approach) اپنانے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی تنازع کو بین الاقوامی ثالثی میں لے جانے سے پہلے اسے ملک کے اندر آٹھ ماہ کی لازمی مدت تک حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم، غالب امکان یہی ہے کہ اس عمل سے تنازعات کے حل میں صرف تاخیر ہوگی، تنازعوں کا خاتمہ نہیں۔"

نگران حکومت کے دور میں پاکستانی ریاست کا یہ فیصلہ اور بعد ازاں SIFC جیسے ادارے کا قیام جس کا مقصد غیر ملکی ریاستوں اور کمپنیوں سے سرمایہ کاری حاصل کرنا ہے، دراصل ریاست پاکستان پر پڑنے والے شدید دباؤ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ اقدامات نہ صرف عوامی خواہشات کے خلاف ہیں بلکہ ملک کے اندر سیاسی کشیدگی اور تصادم کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ صوبہ بلوچستان کی صوبائی حکومت نے وفاقی حکومت کو آسٹریلوی کمپنی Tethyan Copper Company کو بلوچستان کے تانبے اور سونے کی کانوں کا استحصال کرنے کی اجازت دینے کے فیصلے کو چیلنج کیا تھا اور اس معاہدے کو توڑ دیا تھا لیکن بعد میں ICSID کی جانب سے پاکستان پر لگائے گئے اربوں ڈالر کے جرمانے نے ریاست کو مجبور کیا کہ وہ کمپنی کو دوبارہ بلوچستان میں کام کرنے کی اجازت دے وہ بھی ایک ایسے صوبے میں جہاں نسلی آزادی کی تحریک کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ [واضح رہے اس طرح کے معاشی اقدامات نہ صرف مقامی آبادی کو مزید بیگانہ کرتے ہیں بلکہ پہلے سے موجود سیاسی علیحدگی پسندی کو بھی مزید ہوا دیتے ہیں۔

عوام پر اثرات

آئی ایم ایف کے بیل آؤٹ معاہدوں نے عوام بالخصوص شہری غریبوں اور دیہی آبادیوں پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔ آئی ایم ایف کی شرائط کو بحران زدہ معیشت کے مسائل کو مد نظر رکھے بغیر ہی زبردستی لاگو کیا گیا۔ جس پر کورونا کی عالمی وباء اور 2022 کے تباہ کن سیلاب نے صورتحال کو مزید ابتر کر دیا۔ ملک میں عوام کی حالت زار کو ٹیبل 1 میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے، جہاں کنزیومر پرائس انڈیکس (CPI) یعنی مہنگائی کی شرح 2011 سے 2018 کے درمیان 4.7 فیصد سے بڑھ کر 2022-2023 میں 28.2 فیصد ہو گئی۔ اس عرصے میں یقیناً ملک کو اور دنیا کو کئی سنگین بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں 2022 کا سیلاب، کورونا کی عالمی وباء اور روس یوکرین کی جنگ کے ساتھ دیگر شامل ہیں۔ 2019 میں آئی ایم ایف کے اسٹینڈ بائی معاہدے کے وقت یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ افراط زر میں کئی گنا اضافہ ہو گا جو کہ اب صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ

اندازے درست ثابت ہو رہے ہیں۔ بہر کیف اس وقت کی نگران حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ آئی ایم ایف کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی بنا پر عوام یا صنعتوں کو کسی بھی قسم کی سہولت فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

ملک میں معاشی بحران کی شدت کا اندازہ عالمی بینک کے جاری کردہ اعداد و شمار سے بھی ہوتا ہے کہ صرف ایک سال میں غربت کی شرح 34ء2 فیصد سے بڑھ کر 39ء4 فیصد ہو گئی ہے۔³² اس کا مطلب ہے کہ مزید 1 کروڑ 25 لاکھ افراد عالمی بینک کے مقرر کردہ خط غربت یعنی 3ء65 امریکی ڈالر یومیہ آمدنی سے بھی نیچے پہنچ چکے ہیں۔ عوام کی مشکلات کی ایک اور بڑی وجہ روپے کی قدر میں شدید کمی بھی ہے جو کہ آئی ایم ایف کی ایک بنیادی شرط رہی ہے۔ 2020 سے 2023 کے درمیان پاکستانی روپیہ امریکی ڈالر کے مقابلے میں 161ء8 پاکستانی روپیہ سے گر کر 278 پاکستانی روپیہ تک آ گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کی 2023 کی کثیر الجہتی غربت کے اشاریہ (ملٹی ڈائمنشنل پاورٹی انڈیکس) کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 21ء5 فیصد آبادی شدید کثیر الجہتی غربت کا شکار ہے جبکہ 12ء5 فیصد آبادی کثیر الجہتی غربت میں لاحق ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔

بجلی، گیس، اور پانی کے بلوں میں مسلسل بے تحاشہ اضافے نے ملک بھر میں عوام کے ساتھ ساتھ کاروباری اور تجارتی طبقہ میں بھی غصہ، احتجاج اور ہڑتالوں کی شدت میں اضافہ کیا ہے۔ معاشی زوال کے اثرات ٹیکسٹائل برآمدات اور صنعتی پیداواری صلاحیت پر بھی پڑے ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان اس لحاظ سے بنگلہ دیش، چین اور ویتنام سے پیچھے رہ گیا ہے۔³³ پاکستانی صنعتی پیداواری (مینوفیکچرنگ) شعبے میں پرانی و فرسودہ ٹیکنالوجی، تباہ حال انفراسٹرکچر، اور سرکاری و نجی سرمایہ کاری کی کمی کے باعث مقامی صنعتکاروں کے لیے غیر ملکی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ پاکستان کو اپنی صنعتی ترقی اور بنیادی ڈھانچے کی جدت پر فوری توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ ایندھن کی قیمتوں میں اضافہ جو نقل و حمل اور دیگر کاروباری سرگرمیوں کی لاگت کو بڑھا دیتا ہے، برآمدات میں اضافے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے مقامی صنعتکار منافع کمانے میں ناکام رہ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں متعدد کارخانے اور کمپنیاں بند ہو گئی ہیں نتیجہً صنعتی پیداوار میں واضح کمی آئی ہے۔ آئی ایم ایف کے قلیل مدتی قرضوں کی شرائط نے اس تمام صورتحال اور مسائل کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ حکومت پاکستان جو آئی ایم ایف کی کفایت شعاری (austerity) پالیسی کے تحت اخراجات میں کمی اور بین الاقوامی تجارت کو آزاد کرنے اور ڈالر پر ریاستی اختیار ختم کرنے پر مجبور ہے اور ان تمام اہداف کو حاصل کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔

ملک میں معاشی بحران کی شدت کا اندازہ عالمی بینک کے جاری کردہ اعداد و شمار سے بھی ہوتا ہے کہ صرف ایک سال میں غربت کی شرح 34ء2 فیصد سے بڑھ کر 39ء4 فیصد ہو گئی ہے۔³² اس کا مطلب ہے کہ مزید 1 کروڑ 25 لاکھ افراد عالمی بینک کے مقرر کردہ خط غربت یعنی 3ء65 امریکی ڈالر یومیہ آمدنی سے بھی نیچے پہنچ چکے ہیں۔ عوام کی مشکلات کی ایک اور بڑی وجہ روپے کی قدر میں شدید کمی بھی ہے جو کہ آئی ایم ایف کی ایک بنیادی شرط رہی ہے۔ 2020 سے 2023 کے درمیان پاکستانی روپیہ امریکی ڈالر کے مقابلے میں 161ء8 پاکستانی روپیہ سے گر کر 278 پاکستانی روپیہ تک آ گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کی 2023 کی کثیر الجہتی غربت کے اشاریہ (ملٹی ڈائمنشنل پاورٹی انڈیکس) کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 21ء5 فیصد آبادی شدید کثیر الجہتی غربت کا شکار ہے جبکہ 12ء5 فیصد آبادی کثیر الجہتی غربت میں لاحق ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔

بجلی، گیس، اور پانی کے بلوں میں مسلسل بے تحاشہ اضافے نے ملک بھر میں عوام کے ساتھ ساتھ کاروباری اور تجارتی طبقہ میں بھی غصہ، احتجاج اور ہڑتالوں کی شدت میں اضافہ کیا ہے۔ معاشی زوال کے اثرات ٹیکسٹائل برآمدات اور صنعتی پیداواری صلاحیت پر بھی پڑے ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان اس لحاظ سے بنگلہ دیش، چین اور ویتنام سے پیچھے رہ گیا ہے۔³³ پاکستانی صنعتی پیداواری (مینوفیکچرنگ) شعبے میں پرانی و فرسودہ ٹیکنالوجی، تباہ حال انفراسٹرکچر، اور سرکاری و نجی سرمایہ کاری کی کمی کے باعث مقامی صنعتکاروں کے لیے غیر ملکی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ پاکستان کو اپنی صنعتی ترقی اور بنیادی ڈھانچے کی جدت پر فوری توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ ایندھن کی قیمتوں میں اضافہ جو نقل و حمل اور دیگر کاروباری سرگرمیوں کی لاگت کو بڑھا دیتا ہے، برآمدات میں اضافے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے مقامی صنعتکار منافع کمانے میں ناکام رہ جاتا ہیں جس کے نتیجے میں متعدد کارخانے اور کمپنیاں بند ہو گئی ہیں نتیجہً صنعتی پیداوار میں واضح کمی آئی ہے۔ آئی ایم ایف کے قلیل مدتی قرضوں کی شرائط نے اس تمام صورتحال اور مسائل کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ حکومت پاکستان جو آئی ایم ایف کی کفایت شعاری (austerity) پالیسی کے تحت اخراجات میں کمی اور بین الاقوامی تجارت کو آزاد کرنے اور ڈالر پر ریاستی اختیار ختم کرنے پر مجبور ہے اور ان تمام اہداف کو حاصل کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔

روپے کی قدر میں شدید کمی کی وجہ سے جہاں خوراک اور ایندھن مہنگے ہوئے ہیں وہیں اسٹیل، پلاسٹک، دھاتوں اور صنعتی کیمیائی مادوں (کیمیکلز) جیسی بنیادی صنعتوں کی اشیاء کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ اپنی تاریخ کے زیادہ تر ادوار میں پاکستان کپاس کو برآمد کرنے والا ملک رہا ہے لیکن آج کی صورتحال بالکل اس کے برعکس ہے۔ حالیہ پاکستان کو ہر سال تقریباً 2 ارب امریکی ڈالر کی خام کپاس درآمد کرنی پڑ رہی ہے جس سے ٹیکسٹائل مصنوعات بنا کر برآمد کیا جا رہا ہے۔³⁴ آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن (APTMA) کے مطابق بجلی کی بلند قیمتیں پنجاب کی ٹیکسٹائل برآمدات کے لیے خطرہ بن چکی ہیں۔ [توانائی کی لاگت اتنی زیادہ ہے کہ پیداواری لاگت میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے، جس سے عالمی منڈی میں پاکستانی مصنوعات مقابلہ نہیں کر پاتے۔] حکومت کی نجی شعبے کی پاور کمپنیوں (IPPs) کو بروقت ادائیگی میں ناکامی نے ملک میں بار بار اور شدید لوڈ شیڈنگ کو جنم دیا ہے۔ توانائی کے عدم تسلسل کے سبب ملک بھر میں کمپنیوں کو اپنی کاروباری سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ذاتی جزیئرز اور متبادل بجلی کا نظام (بیک اپ پاور سسٹمز) لگانے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ اس ساری صورتحال میں جو بھی حکومت اقتدار میں آتی ہے اسے فوری طور پر زر مبادلہ کے ذخائر کی کمی اور کرنٹ اکاؤنٹ خسارے جیسے بحرانوں سے نمٹنے کے لیے اقدامات کرنا پڑتے ہیں۔ کم زر مبادلہ اور معاشی دشواری کے نتیجے میں ہونے والے دیوالیہ (ڈیفالٹ) کے خطرے کے باعث سیاسی قیادت کو فنڈز کے لیے بیرون ممالک سے آسرا لگانا پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ آئی ایم ایف کی منظوری کے بغیر اکثر دیگر بین الاقوامی مالیاتی ادارے (آئی ایف آئیز / IFIs) ممالک کو قرضہ دینے سے اجتناب برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیوالیہ ہو جانے کا خوف منتخب حکمرانوں کو آئی ایم ایف کے پاس جا کر قرضہ مانگنے پر مجبور کرتا ہے۔ بجلی کے شعبے کی نجکاری کی وجہ سے پاکستان کا تجارتی اور بجٹ خسارہ اپنی بدترین حد تک پہنچا ہوا ہے۔ [نجی بجلی گھروں سے مہنگے داموں بجلی خریدنے اور بیچنے کی ضمانتوں نے قومی خزانے پر بھاری بوجھ ڈال دیا ہے جس کا اثر عام صارف پر انتہائی مہنگی بجلی کی صورت میں پڑتا ہے۔] قابل غور نقطہ یہ ہے کہ صنعتی شعبے کی گرتی ہوئی پیداواری صلاحیت اور کارخانوں کی بندش کا براہ راست اثر مزدور طبقے پر پڑتا ہے مثلاً بیروزگاری، اجرتوں کی کمی، اور کام کے غیر محفوظ حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

قرضہ جات اور عورتوں کے انسانی حقوق کی پامالی

پاکستان کی عورتیں انتہائی زبوں حالی کا شکار ہیں کیونکہ ملک کے موجودہ کھوکھلے قوانین صرف کاغذی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ سامراجی عالمگیریت زیادہ سے زیادہ عورتوں کو کم ترین اجرت پر پست ترین مزدوری کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ان کو فرمانبردار، طالبہ دار، اور زیادہ محنتی مزدور تصور کیا جاتا ہے جنہیں مساوی اور بعض صورتوں میں زیادہ کام کے بدلے کم اجرت دی جاتی ہے۔ قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں (National Commission on the Status of Women / NCSW) کی ایک رپورٹ کے مطابق:³⁵

"عالمی اشاریوں اور رپورٹس میں پاکستان کی کارکردگی انتہائی ناقص ہے۔ عالمی صنفی فرق رپورٹ (گلوبل جینڈر گپ رپورٹ) 2022 کے مطابق پاکستان 146 ملکوں میں سے 145 ویں نمبر درجہ پر صرف افغانستان سے بہتر تھا۔ انسانی ترقی کے اشاریے (ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس / HDI) 2021-2022 کے دورانیہ میں پاکستان سات درجے کم ہو کر 192 ممالک میں سے 161 ویں نمبر پر آگیا جبکہ رول آف لاء انڈیکس (Rule of Law Index) میں پاکستان 140 میں سے 129 ویں درجہ پر ہے۔"

پاکستان میں محنت کش مزدوروں کی تعداد میں 13 لاکھ افراد کا اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی مزدور قوت (لیبر فورس) میں دیگر جنوبی ایشیائی ممالک جیسے کہ بھارت (81ء3 فیصد)، بنگلہ دیش (73ء4 فیصد)، اور سری لنکا (51ء8 فیصد) کے مقابلے میں پاکستان میں عورتوں کی بے روزگاری کی شرح سب سے زیادہ (54ء10 فیصد) ہے۔ اسی طرح پاکستان کی عورتوں کی لیبر فورس (مزدور قوت) میں شمولیت کی شرح بھی خطے میں سب سے کم 22 فیصد ہے جبکہ دیگر جنوبی ایشیائی ممالک جیسے کہ بھارت میں 26 فیصد، سری لنکا میں 30 فیصد، اور بنگلہ دیش میں 43 فیصد ہے۔³⁶ 2021 میں آئی ایم ایف شرائط کے اثرات اس طرح رپورٹ ہوئے تھے:³⁷

"تقریباً 70 فیصد عورتیں غیر رسمی شعبہ (معیشت) میں کسی بھی قسم کے سماجی تحفظ کے حصول کے بغیر ہی کام کرتی ہیں۔ اپنی ذاتی زمین یا گھر کی ملکیت میں عورتوں کا تناسب دو فیصد سے بھی کم ہے۔ جبکہ کاروباری مالیات میں عورتوں کا حصہ محض 19 فیصد ہے۔³⁸ صرف 11 فیصد عورتوں کے بینک اکاؤنٹس ہیں جبکہ مردوں میں یہ شرح 21 فیصد ہے۔ چھوٹے اور درمیانے درجے کے رسمی کاروباری ملکیت میں عورتوں کے پاس محض 6 فیصد ہے جو ورک فورس (افراد قوت) میں عورتوں کی نمائندگی کی انتہائی کم سطح کو ظاہر کرتا ہے۔۔۔ بنیادی اشیائے خورد و نوش و خوراک اور گھریلو ضرورت کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ نے مزدور اور پسے ہوئے طبقہ بالخصوص عورتوں پر اضافی بوجھ ڈالا ہے۔ مثال کے طور پر گندم کے آٹے کی قیمت میں 39 فیصد، پیٹرول میں 79 فیصد، کھانا پکانے اور گرمی کے لیے استعمال ہونے والے ایل پی جی سیلنڈر کی قیمت میں 92 فیصد، اور لکڑی یا کونکے کی قیمت میں 14 سے 28 فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو ایندھن کے لیے لکڑیاں ڈھونڈنے میں زیادہ وقت اور گھریلو ضروریات پر زیادہ رقم خرچ کرنی پڑ رہی ہے۔"

گزشتہ کئی دہائیوں سے آئی ایم ایف کے اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرامز (SAPs) کے نفاذ کے بعد سے غیر رسمی شعبے میں عورتوں کا مسلسل بڑھتا رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ جب مرد مزدوروں کو مستقل اور پائیدار ملازمتوں سے بے روزگار کیا گیا تو

اس کا براہ راست اثر عورتوں، خاص طور پر گھروں میں کام کرنے والی گھریلو ملازماؤں، کا غیر رسمی شعبہ میں اضافہ کی صورت میں ہوا اور مزدور عورت کی تعداد میں اضافے کی ایک بڑی وجہ بن گیا۔ ایک طرف عورتیں مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی اور معاشی بد حالی کا سامنا کر رہی ہیں تو دوسری طرف انہیں پدر شاہی سماجی اقدار کی بھینٹ چڑھا کر چار دیواری میں محدود کر دیا جاتا ہے جس کا فائدہ منڈی کی سرمایہ دارانہ قوتیں ان کی محنت کو کم اجرت میں بٹور کر اٹھاتی ہیں اور عورتیں اپنے حق کی مناسب اجرت سے بھی محروم ہو کر استحصالی قوتوں کے آگے مجبور ہو جاتی ہیں۔ ان مالی مشکلات کی وجہ سے گھریلو اخراجات پورے نہ ہونے کی صورت میں گھروں میں عدم برداشت اور گھریلو تشدد کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا ہے جس کا شکار بھی عورت ہی بنتی ہے۔³⁹ عورتوں کے مطابق یہ صورتحال کوئی نئی نہیں بلکہ ایک دہائی قبل بھی گیس اور بجلی کے بلوں کی ادائیگی ان کے لیے ایک بڑا معمہ تھا اور مردوں کی آمدنی گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ مزید یہ کہ:⁴⁰

"۔۔۔ جو خاندان کرائے کے مکانوں میں رہائش پذیر ہیں ان کی زندگی دوہری افیت میں ہے۔ مردوں کی کمائی مکان کا کرایہ ادا کرنے میں خرچ ہو جاتی ہے اور جو کچھ عورتیں کم پاتی ہے ان سے گھر کے روزمرہ کی خوراک و پانی کے بندوبست میں خرچ کیا جاتا ہے۔"

اسی وقت ٹیکسٹائل کے شعبے میں ملازمت پیشہ افراد کو بھی آئی ایم ایف کی طرف سے پیداواری شعبوں پر عائد کردہ بھاری ٹیکسوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ 2023 میں برآمدات میں کمی، ضروری درکار درآمدات کے لیے زرمبادلہ کی قلت، اور آئی ایم ایف پروگرام کے تحت لگائے گئے بھاری محصولات (ٹیکس) کی وجہ سے ملک بھر میں ستر لاکھ مزدوروں کو نوکریوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔⁴¹ اس صورتحال سے سب سے زیادہ عورتیں متاثر ہوئیں۔ فیصل آباد جیسے شہر میں جو کہ ٹیکسٹائل شعبہ کا سب سے فعال شہر مانا جاتا ہے، 13 لاکھ مزدور بیروزگار ہوئے جن میں 50 فیصد عورتیں شامل تھیں۔ جو عورتیں بہر حال اب بھی برسر روزگار ہیں، وہ کم اجرتوں پر کام کرنے پر مجبور ہیں اور انہیں کام کی جگہ پر ہر اسانی کا بھی مسلسل سامنا ہے۔⁴²

چونکہ بڑے پیمانے کی اقتصادی (میکرو اکنامک) پالیسیاں مجموعی طور پر عمومی معاشی حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور جو عورتوں کے معاشی استحکام اور خود مختار ہونے میں مدد فراہم کرتی ہیں، صنفی مساوات کو ممکن بنانے کے لیے ضروری اور اس کے حصول میں اہم کردار کی حامل ہیں۔ غربت میں زندگی گزارنے والی عورتوں کے لیے خوراک، صحت، تعلیم، تربیت، روزگار کے مواقع اور دیگر بنیادی سہولیات تک رسائی محدود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پدر شاہی نظام صنفی عدم مساوات کو برقرار رکھتا ہے جس کا زہر پاکستانی ثقافت میں پھیل گیا ہے اور اس کا خاتمہ ایک طویل اور مسلسل جدوجہد کا تقاضہ کرتا ہے۔⁴³

[یہ اعداد و شمار اور مباحثہ ظاہر کرتے ہیں کہ معاشی بحران اور قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی معیشت نے عورتوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے جس کے باعث ان کے روزگار، تعلیم، صحت اور سماجی تحفظ کے مواقع مزید محدود ہو گئے ہیں۔ قرضوں کے باعث ریاست جب معاشی کفایت شعاری (austerity) کی پالیسی اختیار کرتی ہے تو سماجی اخراجات میں کمی کی جاتی ہے، مراعات ختم ہوتی ہیں، قیمتیں بڑھتی ہیں، اور روزگار کے مواقع محدود ہوتے ہیں جس کا سب سے زیادہ نقصان بالواسطہ اور بلاواسطہ عورتوں کو ہوتا ہے۔]

مذکورہ بالا تحریر میں تفصیلاً تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سے آئی ایم ایف کے معاہدوں اور پالیسیوں نے سالہ سال عورتوں پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ زندگی گزارنے کا تخمینہ ڈیزل کے بڑھتے ہوئے نرخوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ 1999 میں ڈیزل کی قیمت 8ء10 پاکستانی روپے فی لیٹر تھی، جو 2010 میں 73 روپے پاکستانی فی لیٹر 44 ہو گئی اور یکم اپریل 2024 کو ڈیزل کی قیمت 2ء282 روپے پاکستانی فی لیٹر ہو گئی۔ 45 جس میں 16 اپریل 2024 کو فی لیٹر قیمت میں مزید 5ء8 روپے پاکستانی اضافہ کی توقع ہے۔ 46 نجکاری پالیسی کے تحت آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی (OGRA) ہر 15 دن بعد ایندھن کی قیمتوں میں ردوبدل کی سفارش کرتی ہے۔ 2010 سے 2024 تک ایندھن کی قیمتوں میں تقریباً 287 فیصد اضافہ ہوا ہے جس کا لازماً اثر محنت کش طبقے اور دیہی آبادیوں پر بنیادی ضروریات زندگی کے اخراجات میں بے تحاشہ اضافہ اور پھر ان اخراجات کا پورا نہ ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ تحقیق آئی ایم ایف کی شرائط کا شہری غریب بستیوں اور دیہی آبادیوں دونوں پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے کی گئی ہے۔

شہری غریب عورت

شہری غریب گھرانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور بالواسطہ ٹیکسوں کا نفاذ زندگی کی لاگت اور روزمرہ اخراجات میں اضافہ کا سبب تھا۔ ان عورتوں کے لیے سب سے زیادہ دشوار گھر کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ زیادہ تر عورتیں جنہوں نے فوکس گروپ میں حصہ لیا کرایہ کے گھروں میں رہتی تھیں۔

صفورہ گوٹھ، کراچی میں تمام شریک عورتیں گھریلو ملازمین تھیں جو کہ سب کی سب کرایہ کے گھروں میں رہتی تھیں جہاں نہ صرف جگہ بہت تنگ تھی بلکہ مکانوں کی حالت بھی انتہائی خستہ حال تھی۔ بنارنگ و روغن، بنا پلستر کی دیواریں، ناہموار فرش، اور گلیوں میں ناقص نکاسی آب کا انتظام۔ ان گھروں کے پاس کوئی باقاعدہ لیز بھی نہیں تھی اور حکومت جب چاہے ان مکانوں کو منہدم کر سکتی تھی۔ ماہانہ کرایہ 13 ہزار سے 15 روپے پاکستانی جو کہ تقریباً 47 سے 54 امریکی ڈالر بنتا ہے، تھا جس میں گیس اور بجلی کے اخراجات بھی شامل تھے۔ یہ جگہ عموماً ایک کمرہ، ایک چھوٹا سا معمولی باورچی خانہ اور ایک باتھ روم پر مشتمل ہوتی ہے۔

ناصر کالونی، کورنگی میں کرایہ نسبتاً کچھ کم تھا، یعنی 10 سے 12 ہزار روپے پاکستانی جو کہ تقریباً 36 تا 43 امریکی ڈالر بنتے ہیں لیکن یہاں گیس اور بجلی کے بل علیحدہ ادا کرنے پڑتے تھے۔ گیارہ عورتوں پر مشتمل اس گروپ میں دس عورتیں کرایہ کے کوارٹرز میں رہتی تھیں۔ یہ کالونی شہر کے ایک پرانے آباد حصے میں واقع تھی، جو ملک کے سب سے بڑے صنعتی زون کے قریب ہے۔ یہاں مکانوں کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اگرچہ رقبے کے لحاظ سے مکانات چھوٹے تھے لیکن مرمت شدہ اور لیز شدہ علاقوں میں واقع تھے۔ گیس کے ماہانہ بل 2500 سے 3000 روپے (تقریباً 9 تا 11 امریکی ڈالر) کے درمیان ہوتے تھے اور بجلی کے بل تقریباً 10 ہزار روپے (تقریباً 7ء35 امریکی ڈالر) یا اس کے آس پاس ہوتے تھے۔ یہ اس صورت میں ہوتا تھا کہ جب گھر میں صرف ایک پنکھا ہو اور استری یا فریج موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ گیس کی فراہمی بھی محدود تھی۔ صبح کے وقت گیس کی سپلائی بہت

کم ہوتی تھی اور جمعہ کے دن تو بالکل بھی نہیں آتی تھی۔ ان عورتوں نے یہ بھی شکایت کی کہ انہیں بجلی کے بل میٹر دیکھے بغیر ہی اپنی مرضی سے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں پینے کے پانی کے ساتھ ساتھ اپنے روزمرہ کے دیگر استعمال کے لیے بھی پانی خریدنا پڑتا ہے۔

اس علاقے میں پانی کی فراہمی کے لیے پورے علاقے کو 200 روپے پاکستانی فی گھر ماہانہ کے حساب سے پانی فراہمی کے نگران سرکاری ملازم کو دینے پڑتے ہیں۔ اس اضافی رقم کے بدلے انہیں ہر دوسرے دن رات 11 بجے سے صبح 5 بجے تک پانی فراہم کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے عورتوں کا روزمرہ کا کام مزید بڑھ گیا ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے بہت سی عورتوں کو پینے کا پانی خریدنا پڑتا ہے کیونکہ یہ لائن کا پانی پینے کے قابل نہیں ہے اور مضر صحت ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال محمد پور کی عورتوں کو بھی درپیش تھی۔ محمد پور میں ہر 15 دن بعد سرکاری لائن سے پانی آتا ہے جس کے لیے یہاں کی عورتوں کو بھی پانی کھولنے والے لائن مین کو ماہانہ ہر گھر کو اضافی رقم دینی پڑتی ہے۔ لائنڈھی میں گیس کی شدید قلت کی وجہ سے یہاں گھریلو اخراجات میں بے جا اضافہ ہو جاتا ہے۔ عورتوں کو اسکول جانے والے بچوں کے لیے مجبوراً بازار سے ناشتہ اور کھانا خریدنا پڑتا ہے۔

گھریلو ملازم عورتوں کی ماہانہ آمدنی 3,000 سے 25,000 پاکستانی روپے کے درمیان تھی تاہم زیادہ تر عورتوں کی آمدنی 8,000 سے 10,000 پاکستانی روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ آمدنی اس پر منحصر تھی کہ ایک عورت کتنے گھروں میں اور کس نوعیت کا کام کرتی ہے۔ پیسے بچانے کے لیے یہ عورتیں اپنے کام پر پیدل جاتی تھیں اور واپسی پر چنگی (ایک سستی عوامی سواری) استعمال کرتی تھیں۔ پورے مہینے کا چنگی کا کرایہ تقریباً 520 روپے (تقریباً 2 امریکی ڈالر) بنتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ عورتیں صرف ایک طرف کا کرایہ بچانے کے خاطر پیدل چل کر کام پر جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔

گھریلو ملازم عورتوں نے کہا کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے ان کے کام میں بھی اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ اکثر مالکان ان سے دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کرنے کو کہہ دیتے ہیں جو پیشتر طے نہیں ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے مراعات و عطیات جو ان کو عموماً مالکان کی جانب سے مل جایا کرتے تھے جیسے کہ بچا ہوا کھانا، پرانے کپڑے وغیرہ، وہ بھی اب بہت کم ہو گئے ہیں۔ روزمرہ کے اخراجات بڑھنے کے باوجود بھی ان کی تنخواہیں پرانی ہیں اور وہ اپنی تنخواہیں بڑھانے پر اصرار بھی نہیں کر سکتیں۔ عورتوں کے مطابق ان کی زیادہ تر آمدنی روزمرہ کی خوراک پر ہی صرف ہوتی ہے۔

مشترکہ خاندان میں رہنی والی عورتیں اپنے بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ دیتی ہیں کہ گھر کے دیگر افراد، جو کہ یقیناً گھر کی دوسری کوئی عورت ہی ہوتی ہے، ان کی دیکھ بھال کر لیتی ہے۔ بعض صورتوں میں پڑوسن بھی ان کے بچوں کی دیکھ بھال کر لیتی ہے۔ جن عورتوں کے چھوٹے بچے ہوتے ہیں ان کو کام میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے خاص طور پر جب ان کے بچہ کو گھر میں کوئی سنبھالنے والا نہ ہو۔ اس صورت میں ان کی مالی مشکلات اور حالات مزید ابتر ہو جاتے ہیں۔

ایک عورت محض ایک چھوٹے سے کمرے میں رہ رہی تھی اور ماہانہ 8,000 روپے (تقریباً 29 امریکی ڈالر) اس کمرے کا کرایہ ادا کر رہی تھیں۔ وہ اپنے چھوٹے سے گھر انے کو روزانہ دو وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھلا پارہی تھی۔ اس کا شوہر بھی یومیہ اجرت پر کام کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک مستقل مناسب آمدنی کمانے سے قاصر تھا۔

زیادہ تر مرد تعلیم یا ہنر کی کمی کے باعث صرف دیہاڑی دار مزدور کے طور پر ہی کام کر سکتے تھے۔ وہ کام بھی انہیں کبھی بکھار ہی ملتا تھا جس سے ان کی ماہانہ آمدنی یقینی نہیں تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مردوں کو روزانہ کام نہ ملنے کی وجہ سے اوسطاً وہ عورتوں کے مقابلے میں کم ہی کمپا کرتے ہیں۔ لیکن جب کبھی بھی ان کی دیہاڑی لگتی تو یومیہ 1200 روپے (3 امریکی ڈالر) اجرت ملتی۔

کئی گھریلو ملازم عورتیں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ ایک عورت ایک ایسے گھر میں کام کرتی تھیں جہاں بچوں کو ٹیوشن دیا جاتا تھا۔ تو اس نے اپنی بیٹی کو اسی عورت کے پاس ٹیوشن کے لیے بھیجنا شروع کر دیا اور بدلے میں وہ اس گھر کی صفائی بغیر کسی اجرت کے کر دیا کرتی۔ کچھ عورتوں نے بتایا کہ وہ مجبوراً اپنے بچوں کو سرکاری اسکول بھیج رہی ہیں کیونکہ نجی اسکولوں میں نہ تو مزید بچوں کی گنجائش ہے اور نہ ہی وہ ایسے بچوں کو لیتے ہیں جو داخلے کی عمر کی حد سے بڑے ہو چکے ہوں۔ ایک عورت نے پہلے اپنے بچے کو سرکاری اسکول میں داخل کروایا تھا لیکن وہاں ناقص تعلیمی معیار کی وجہ سے دوبارہ نجی اسکول میں ہی داخل کر دیا۔

ناصر کالونی، کورنگی میں زیادہ تر عورتوں نے بنیادی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ ماضی میں ان عورتوں کو کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ گھر کے مرد حضرات کی آمدنی تین وقت کے کھانے اور دیگر اخراجات کے لیے کافی تھی۔ لیکن فیکٹریاں بند ہونے کی صورت میں اب نہ تو کام ہے، نہ دیہاڑی، نہ تنخواہ میں اضافہ اور نہ ہی کوئی سالانہ بونس وغیرہ۔ گزشتہ پانچ سے چھ سال کے عرصہ میں ہر خاندان کی معاشی حالت بدتر ہی ہوئی ہے۔ ایک عورت نے بتایا کہ ان کے شوہر کی تنخواہ 28 سال مسلسل ملازمت کرنے کے باوجود بھی صرف 30 ہزار روپے ہی ہے۔ اس معاشی زبوں حالی کی بنا پر اپنے مالی معاملات کو بہتر بنانے کے لیے ان عورتوں کو اپنے گھر اور خاص طور پر اپنے شوہروں سے نوکری کرنے کی اجازت ملی۔ ایک عورت ادویات کی بیکنگ کا کام کر کے ماہانہ 10 سے 12 ہزار روپے کمالیتی ہے۔ یہ صورت حال کورونا کی وباء کے لاک ڈاؤن کے بعد زیادہ خراب ہونا شروع ہو گئی۔ ایک عورت نے بتایا:

"لاک ڈاؤن سے پہلے ہماری زندگی بالکل مختلف تھی کیونکہ گیس اور بجلی کے بلوں پر کوئی خاص ٹیکس نہیں تھا، اور ہمیں مزدوری بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔"

تقریباً تمام ہی عورتیں کہیں نہ کہیں کام ضرور کر رہی تھیں۔ کوئی گھر میں ہوم بیسڈ ورکر کے طور پر کام کر رہی تھی تو کوئی علاقے کے کسی کارخانے میں۔ ایک عورت جو ایک بہت چھوٹے سے مکان میں رہتی تھیں، جہاں باقاعدہ کوئی باورچی خانہ بھی نہیں تھا، گھر پر ہی سمو سے بنایا کرتی تھی۔ اس نے پہلے مزدوری کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے چھوٹے بچوں کی وجہ سے گھر پر ہی کھانے پینے کی اشیاء تیار کرنا شروع کر دیں۔ وہ دن کے وقت سمو سے تیار کرتی اور پھر شام میں گھر کے سامنے ہی انہیں بیچا کرتی۔ اس عورت کے مطابق ان سموں سے گھر کے روزمرہ کے کھانے پینے اور بچے کے چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر فیکٹری میں کام کرتا ہے اور تقریباً 30 ہزار روپے تک کمالیتا ہے جو کہ مکان کا کرایہ اور دیگر یوٹیلیٹی بل میں بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ ایک اور عورت اسکول کی کینٹین میں آلو چاٹ تیار کر کے بیچتی ہے۔

ایک عورت نے بتایا کہ اس کا شوہر حیدر آباد شہر میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور وہیں رہائش پذیر ہے۔ وہ کراچی اس لیے نہیں آتا کہ اب وہ 50 برس کا ہو گیا ہے اور اگر اس نے حیدر آباد والی ملازمت چھوڑ دی تو اسے یہاں کراچی میں کام نہیں ملے گا۔ اس کے بھیجے گئے پیسوں سے ان کا روز مرہ کا خرچہ بھی مشکل سے ہی پورا ہو پاتا ہے۔ جبکہ اس ایک بیٹا یہاں کراچی کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور اس ہی کی تنخواہ سے مکان کا کرایہ اور دیگر بل ادا ہوتے ہیں۔

ایک دوسری عورت نے بتایا کہ اس کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ اپنے پیچھے ایک کمسن اولاد اور بیوہ کو چھوڑ گیا ہے۔ اس عورت کے اپنے دو بیٹے چھوٹے ہیں جو کام نہیں کرتے اور ایک بیٹا ہے جو ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے۔ اس خاندان کا بڑی ہی مصیبتوں سے گزارا ہو پارہا ہے۔ اپنے مالی مشکلات میں کچھ سہارے کے لیے انہوں نے اپنے گھر میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں رکھ لی ہیں تاکہ اسے بچ کر آمدنی کی کوئی اضافی راہ نکال سکے۔

انہوں نے مزید کہا کہ گھریلو اخراجات میں سب سے بڑا مسئلہ ہر ماہ بڑھتے بجلی کے بل ہیں کیونکہ ان کی ادائیگی ایک عذاب ہے۔ محمد پور، قصبہ کالونی میں صرف چند عورتیں کرائے کے مکانوں میں رہتی تھیں جن کا کرایہ تقریباً 10,000 روپے تھا، جبکہ بجلی کے بل 4,000 سے 7,000 روپے ماہانہ تھا۔ بجلی کی قیمتوں میں اضافے کے باعث زیادہ تر عورتوں نے بجلی کا استعمال کافی حد تک کم کر دیا تھا جیسے کہ کپڑوں کو استری نہ کرنا اور رات کے اوقات میں فریج بند کر دینا وغیرہ۔ ایک عورت نے بتایا کہ بجلی بچانے کے لیے اس نے اپنے ملبوسات کو استری کرنا بالکل ہی بند کر دیا ہے وہ محض اپنے شوہر اور اسکول جانے والے بچوں کے یونیفارم استری کرتی ہے۔ گیس اور بجلی کی بندش (لوڈ شیڈنگ) کے اوقات غیر متعین ہیں۔ کچھ لوگوں نے گیس کھینچنے والی غیر قانونی مشینیں لگا رکھی ہیں۔ جس کی وجہ سے پورے محلے کو گیس کے حصول میں پریشانی کا سامنا ہے۔ اسی وجہ سے ایک عورت جو کہ دیہی پنجاب سے یہاں منتقل ہوئی تھی، گیس کی کمی کے باعث لکڑی کے چولہے پر کھانا پکانا شروع کر دیا تھا۔ دیگر عورتوں نے کہا کہ چونکہ انہیں لکڑی کے چولہے پر کھانا پکانا نہیں آتا اس لیے وہ خود کو بہت لاچار محسوس کرتی ہیں کیونکہ خاص طور پر اسکول جانے والے بچوں کے لیے وقت پر کھانا تیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لاندھی میں بھی عورتوں نے لکڑی پر کھانا پکانا شروع کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی چند عورتوں نے دھوئیں کے باعث دمے اور سانس میں تکلیف کی بھی شکایت کی۔

محمد پور کی زیادہ تر عورتیں گھریلو سطح پر کام (ہوم بیسڈ ورک) کرتی تھیں جن میں پلاسٹک مولڈنگ، کپڑے کی کٹائی، اور سلائی جیسی مشینیں استعمال ہوتی تھیں لیکن بہت زیادہ مہنگی بجلی کی وجہ سے ان کے لیے اس کام سے آمدنی حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روزانہ کی بنیاد پر کئی کئی گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ اب معمول بن گیا ہے۔ کورونا کی وباء سے پہلے ان کے شوہروں کے پاس پورے ہفتے کافی کام ہوتا تھا لیکن اب ان میں سے اکثر بیروزگار ہو چکے ہیں کیونکہ علاقے میں اب فیکٹری یا روزگار کے مواقع نہیں رہے جس کے باعث لوگ باعزت مناسب آمدنی کمانے سے قاصر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کے خیال میں ان کی صلاحیتیں کام کو حاصل کرنے کے لیے ناکافی اور محدود ہیں جس سے وہ اپنی مالی مشکلات میں بہتری لاسکیں۔ مہنگائی اور بہتر معیار زندگی نہ ہونے کی بناء پر عورتیں بے بس اور ذہنی دباؤ محسوس کرتی ہیں۔ ان کے مطابق:

"ہماری اور ہمارے مردوں کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی ہم اپنی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا نہیں کر پائے۔ پچھلے آٹھ سالوں سے ہم مسلسل اپنی ضروریات اور خواہشات کو قربان کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

اشیائے خورد و نوش میں سب سے مہنگی اشیاء چاول اور آٹا ہے جس نے ہماری خوراک کو بتدریج کم کر دیا ہے۔ ایک نوجوان عورت نے بتایا کہ اس کے گھر والے محلے کی ایک کریانے کی دکان سے گھر کا راشن ادھار پہ لیتے ہیں اور مہینہ کے آخر میں ادائیگی کر دی جاتی ہے۔ تاہم اس عورت کو اندیشہ تھا کہ دکاندار کھاتہ درست طریقے سے نہیں لکھتا۔ چونکہ ادائیگی بعض اوقات وقت پر نہیں ہوتی اس لیے زیادہ پوچھنے کے مجاز بھی نہیں رہ پاتے۔ ایک اور عورت نے بتایا کہ وہ گزشتہ ایک سال سے گھر کا سودا سلف اکٹھا نہیں خرید پارہی۔ وہ روزانہ کی بنیاد پہ صرف اتنا ہی خریدتی ہے جتنی ضرورت اور جتنی نقد رقم ہوتی ہے۔

ایک اور دلچسپ فرق یہ تھا کہ ان لوگوں نے اپنے بچوں کو کرایہ کے بڑھ جانے کی وجہ سے سرکاری اسکول سے نکال کر نجی اسکولوں میں داخل کروا دیا تھا کیونکہ سرکاری اسکول دور تھا اور بچوں کو وہاں بھیجنا مہنگا پڑ رہا تھا۔ مگر نجی اسکولوں کا معیار اور حالت بہت خراب تھی خاص طور پر بیت الخلاء کی سہولت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ وہ ان نجی اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ کچھ عورتوں نے فیس نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کو اسکول سے اٹھوا لیا تھا اور ان کی تعلیم رکوا دی تھی۔

ناصر کالونی میں ایک خاندان کے چار افراد ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور جس گھر میں وہ مقیم تھے وہاں چار اور خاندان رہائش پذیر تھے۔ ہر خاندان کا ایک کمرہ تھا اور وہ بجلی کا بل آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے جو کہ تقریباً 50 ہزار روپے (178 امریکی ڈالر) تک کا ہوتا تھا۔

ایک اور خاندان میں ایک عورت کی دو بیٹیاں تھیں جن میں سے چھوٹی والی جس کی عمر محض 14 سال تھی، ایک دوا ساز کمپنی میں کام کیا کرتی تھی۔ اس عورت نے اپنے بڑی بیٹی کو صرف اس لیے کام پہ نہیں بھیجا تھا کیونکہ یہ معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس کے کام پہ جانے سے اس کی عزت اور کردار پہ سوال اٹھتے اور اسکی شادی کے لیے کوئی مناسب اور شریف رشتہ نہیں آتا۔ وہ عورت اپنی چھوٹی بیٹی کو بھی مجبوراً کام پہ بھیجا کرتی تھی کیونکہ اس کے بغیر گھر کے اخراجات پورے کرنا ناممکن تھا۔

لانڈھی نمبر 1 کی تمام شرکاء عورتیں اپنی ذاتی مکان میں رہائش پذیر تھیں لیکن ان تمام عورتوں میں ڈپریشن اور بے چینی سمیت دیگر نفسیاتی و ذہنی دباؤ اور امراض کے ساتھ ساتھ فشار خون کے مسائل نمایاں تھے۔ ماضی میں ان تمام عورتوں کے مالی حالات کافی بہتر ہوا کرتے تھے لیکن پچھلے چند برسوں میں علاقے کی کئی فیکٹریاں بند ہونے کے باعث ان کے گھر کے مرداب بیروزگار ہو چکے تھے۔ آمدنی کم ہو جانے کی وجہ سے گھریلو اخراجات کو پورا کرنا اب ان عورتوں کے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس آبادی میں روایتی پدر شاہی کی قدریں کافی مضبوط تھی جس کی وجہ سے کوئی بھی عورت گھر سے باہر روزگار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

ایک گھر میں رکشہ موجود تھا مگر ایندھن کی قیمتیں بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا شوہر رکشہ باقاعدگی سے نہیں چلاتا تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے مناسب روزی نہیں کما پا رہا تھا۔ عورتوں نے گھر میں دھاگہ تراشنا (کراپنگ) اور پننگ سازی جیسے کام لینے شروع کر دیے تھے مگر یہ کام نہ تو مستقل تھے اور نہ ہی ان کو اس کام کی معقول اجرت ملتی تھی۔ ایک عورت نے کہا کہ:

"ایک ماں کے لیے ایسے حالات میں جینا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر جب وہ اپنے بچوں کو بیماریوں اور غذائی کمی سے دوچار دیکھتی ہے اور اس کا شوہر بھی دن بھر کام کی تلاش کے بعد گھر خالی ہاتھ لوٹتا ہے۔"

اسی فوکس گروپ میں ایک بیوہ عورت بھی تھی جس کا شوہر چند برس پہلے ہی فوت ہوا تھا۔ وہ عورت اپنے دیور کے خاندان کے ساتھ ہی رہتی تھی جو اسے گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے وہ گھر میں ہی پننگ سازی کا کام کرتی تھی۔ اس کام میں اسے 100 پننگوں کے عوض صرف 150 روپے (5 امریکی ڈالر) ہی ملا کرتے تھے۔ اس عورت کے تین بچے تھے جس میں سے ایک بڑا بیٹا 13 سال کا تھا۔ وہ عورت اپنے اس بیٹے کو کام پر نہیں جانے دیتی تھی تاکہ وہ کم از کم اپنی بنیادی تعلیم مکمل کر کے اپنا کوئی بہتر مستقبل سنوار سکے۔ ذیابیطس کی مریضہ ہونے کے باوجود بھی اس کے پاس علاج معالجہ کا نہ تو کوئی بندوبست تھا اور نہ ہی اس کی استطاعت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ:

"جب میرا بیٹا مجھے تکلیف میں دیکھتا ہے تو بار بار باہر جا کر روزگار تلاش کرنے کی ضد کرتا ہے لیکن میں اس کے بہتر مستقبل کی خواہاں ہوں۔"

تمام فوکس گروپس میں عورتوں نے صحت کے مختلف مسائل اور علاج معالجے تک رسائی میں مشکلات کی شدید شکایت کی۔ غازی گوٹھ کی عورتوں کی عمومی رائے یہی تھی کہ وہ کراچی کے ہسپتالوں میں علاج کرانے کی غرض سے جانے سے کتراتے ہیں کیونکہ انہیں سرکاری ہسپتالوں میں ناقص علاج اور لاپرواہی، ڈاکٹروں کی عدم موجودگی، مہنگی ادویات کے ساتھ ساتھ ادویات کی عدم دستیابی اور ڈاکٹروں، اسٹاف اور انتظامیہ کی جانب سے توہین آمیز اور حقیرانہ رویہ بھگتنا پڑتا ہے۔ غازی گوٹھ میں عورتوں کی اکثریت قریبی چھوٹے دواخانوں یا عوامی ٹرانسپورٹ کے ذریعے نجی ہسپتالوں کا ہی رخ کرتی ہیں۔ بڑھتے کرایوں نے اب ان کا نجی ہسپتالوں میں جانا بھی مشکل کر دیا ہے اس لیے اب وہ صرف ایمر جنسی کی ہی صورت میں ہسپتال جاتی ہیں۔ بڑی اور سنگین بیماریوں کی صورت میں غازی گوٹھ کی عورتیں کراچی شہر کو چھوڑ کر اپنے آبائی ضلع رحیم یار خان جانے میں ہی عافیت سمجھ کر وہیں کو ترجیح دیتی ہیں۔

گھریلو ملازم عورتوں کی بانسبت لائڈھی کی عورتیں سرکاری طبی سہولیات سے زیادہ استفادہ حاصل کرتی تھیں۔ تاہم انہوں نے شکایت کی کہ پہلے انہیں سرکاری ہسپتالوں سے مفت ادویات مل جایا کرتی تھیں لیکن اب یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ جناح یا سول ہسپتال جو کہ شہر کے مرکزی علاقوں میں بڑے سرکاری ہسپتال ہیں وہاں جانے کے لیے وہ نئی شروع کی گئی عوامی بس سروس "پیپلز بس سروس" استعمال کرتی ہیں۔ اس سروس کے تحت دو طرح کی بس چل رہی ہیں: ایک "پنک لائن" جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے اور دوسری "ریڈ بس"۔ عورتوں نے بتایا کہ یہ بسیں آسانی سے دستیاب ہیں، آرام دہ ہیں اور اچھی سفری سہولت فراہم کرتی ہیں۔ ایک طرف کا کرایہ پچاس روپے (17 امریکی ڈالر) ہے۔

لانڈھی کی عورتیں کراچی کے نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ فیکٹریاں بند ہونے سے پہلے جب ان کے شوہروں کے پاس باقاعدہ روزگار تھا تب ان کے بچے نجی اسکولوں سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک عورت نے بتایا کہ اس نے اپنے تمام چار بچوں کو نجی اسکول سے نکال کر سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔ ناصر کالونی کی عورتوں نے بھی اسی قسم کے حالات کی نشاندہی کی تھی۔ وہ نہ صرف بڑھتے ہوئے یوٹیلٹی بلوں کی ادائیگی میں ناکام تھیں بلکہ نجی اسکولوں کی فیس بھی ادا کرنا اب ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔

محمد پور کی عورتوں نے بھی یہی کہا کہ ماضی میں سرکاری ہسپتال اور سرکاری اسکول کسی حد تک قابل قبول خدمات فراہم کرتے تھے لیکن اب لوگ سرکاری اداروں میں جانے کے بجائے قریبی دواخانوں یا چھوٹے نجی طبی مراکز کو ترجیح دیتے ہیں۔ نقل حمل کے اخراجات میں اضافہ بھی ان لوگوں کے لیے شہر کے وسط میں واقع بڑے سرکاری ہسپتالوں میں نہ جانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ایک عورت جو دل کی بیماری میں مبتلا تھی، پہلے سرکاری ہسپتال سے مفت دوا حاصل کر لیا کرتی تھی لیکن اب یہ سہولت دستیاب نہیں۔ اس نے کچھ عرصہ اپنی ادویات خرید کر استعمال کیں مگر قیمتوں میں مسلسل اضافے کی وجہ سے پچھلے چار ماہ سے دوا لینا بند کر دی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں، تو ایک عورت ہنستے ہوئے کہنے لگی کہ:

"ہم سب مہنگائی اور آنے والے وقت کے خوف میں کی وجہ سے بلند فشار خون (بلڈ پریشر)، معدے کے مسائل، ذیابیطس، یادل کے مسائل کی دائمی مریض ہیں۔"

یہ وہ جملہ ہے جو تقریباً ہر فوکس گروپ میں عورتوں کی جانب سے بارہا دہرایا گیا۔ عورتیں خاص طور پر اپنے گھر والوں کی ضروری خوراک کے انتظام نہ ہونے کے دباؤ میں خود کو انتہائی بے بس محسوس کرتی ہیں جس نے ان کی ذہنی اور جسمانی صحت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ خوراک کی کمی ہر گھر میں محسوس کی جاتی ہے۔ اس کمی کے باعث اکثر عورتیں اپنے شوہر اور بچوں کے کھانے کے بعد بچا کچا کھا کر گزارا کر لیتی ہیں۔ گیس اور بجلی کے زیادہ بلوں، مہنگی خوراک اور مہنگے کرایوں کے باعث وہ روزمرہ اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک عورت نے کہا کہ:

"ہم گوشت اور پھلوں کا ذائقہ بھول چکے ہیں۔"

آس پڑوس کے تمام ہی لوگ ایک دوسرے سے پیسے ادھار لیتے رہتے ہیں جس کو چکانے کے لیے گھر کے ہر فرد کو اور زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بیماری کی صورت میں بھی یہ لوگ ایک دوسرے سے

رقم ادھار لیکر یا اس مد میں کی گئی پیشگی بچت سے پنجاب کے دیگر شہروں کا سفر کرتے ہیں۔

تمام فوکس گروپس میں شامل عورتوں کا کہنا تھا کہ انہیں اپنی برادری سے ہمت اور حوصلہ ملتا ہے۔ کچھ جگہوں پر عورتیں ایک دوسرے سے قرضہ لیتی اور آمدنی ہونے پر واپس کر دیتی تھیں، تاہم یہ صورت حال ہر جگہ یکساں نہیں۔ زیادہ تر قرضے یا تو ایک دوسرے سے لیے جاتے یا محلے کی دکان سے اس سلسلے میں مدد لی جاتی۔ سب سے زیادہ باہمی جڑت گھریلو ملازم عورتوں کی برادری میں دکھائی دیا، جو ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہمیشہ حاضر تھیں۔ باقی جگہوں پر اگرچہ بیکہتی موجود تھی مگر مالی مدد کا تبادلہ کم تھا۔ ایک عورت نے کہا کہ:

"کسی کے پاس اتنی اضافی آمدنی نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔"

یہ فرق شاید اس وجہ سے تھا کہ گھریلو ملازم عورتوں کی آمدنی نسبتاً مستقل اور طے شدہ ہوتی ہے جبکہ باقی جگہوں پر عورتیں گھریلو صنعتوں پر انحصار کرتی ہیں، جہاں آمدنی غیر یقینی اور غیر مستحکم ہوتی ہے۔ البتہ وہ ایک دوسرے کی کام ڈھونڈنے میں مدد ضرور کرتی تھیں، خاص طور پر گھریلو کام یا ہوم بیسڈ ورک کے لیے۔ فیکٹریوں میں جا کر کام کرنے والی نوجوان لڑکیاں انہیں فیکٹریوں میں جا کر مزدوری کرتی تھیں جہاں ان کی برادری کی دوسری عورتیں پہلے سے ہی جارہی ہوتی ہیں تاکہ انہیں ایک طرح کا اجتماعی تحفظ حاصل رہے اور وہ خود کو محفوظ محسوس کر سکیں۔ عموماً عورتیں قرض لینے سے گریز کرتی تھیں۔ ایک عورت نے کہا کہ:

"قرض ایک مکڑی کے جالے کی مانند ہے، جس سے نکلنا مشکل ہے۔"

کورنگی کی عورتوں نے اپنے مکان مالکان کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بڑھتے بلوں کے باوجود ان کے مالک مکان نے پچھلے چند عرصے سے کرایوں میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ یہیں کی ایک عورت نے بتایا کہ اس کے بچوں کے اسکول کے پرنسپل کے تعاون کی وجہ سے اس کے بچے اب تک نجی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک اور عورت نے خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"یہ تو ہمارے لوگوں کا آپسی تعاون ہی ہے جس نے ہماری تہذیب کو زندہ رکھا ہوا ہے، نہیں تو ہماری حکومت ہمیں تباہ و برباد کر چکی ہے۔"

تمام فوکس گروپ کی کسی بھی عورت کو حکومت کے سوشل سیفٹی نیٹ پروگرامز (سماجی تحفظ کے منصوبے) مثلاً احساس پروگرام یا بینظیر انکم سپورٹ پروگرام سے کسی بھی قسم کی کوئی مدد حاصل نہیں ہو رہی۔

دیہی آبادی کی عورت

دیہی علاقوں میں تحقیق کے لیے چار گاؤں میں فوکس گروپ کیے گئے تھے جن میں سے دو گاؤں مسلمان آبادی اور دو گاؤں ہندو آبادی کے تھے۔ اپنی زمین نہ ہونے کی وجہ سے ان چاروں گاؤں میں لوگوں کے حالات خاص طور پر معاشی اور سماجی حالات کافی خراب تھے۔ یہاں کی آبادی زیادہ تر بے زمین کسان، کھیت مزدور یا اینٹوں کے بھٹوں میں کام کرنے والے مزدور تھے۔

مسلمان گاؤں

پہلا مسلمان گاؤں حضور بخش لاشاری، ٹنڈو محمد خان سے ایک ہی خاندان کے سات گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ان میں پانچ بھائی اور ایک بہن جو اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد اپنے دو شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ گاؤں 16 ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا تھا جس میں سے 10 ایکڑ زمین زراعی پیداوار کے لیے اور 6 ایکڑ زمین رہائش کے لیے استعمال ہوتی۔ گوکہ ہر گھرانہ کا باورچی خانہ علیحدہ تھا لیکن بعض وسائل مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک دوسرے کی ضرورت پڑنے پر مدد بھی کرتے تھے۔

دوسرا مسلمان گاؤں مولا بخش لاشاری، ٹنڈو محمد خان، حضور بخش لاشاری سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ دونوں گاؤں مرکزی شاہراہ سے کافی دور تھے۔ حالانکہ ایک کچی سڑک حضور بخش لاشاری کو مرکزی شاہراہ سے جوڑتی تھی لیکن برسات کے موسم میں یہ راستہ گاڑیوں اور دوسری سواریوں کے لیے ناقابل استعمال ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مولا بخش لاشاری گاؤں بھی کچی شاہراہ سے 2 سے 3 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

مولا بخش لاشاری ایک بڑا گاؤں تھا جس میں تقریباً 50 گھرانے آباد تھے جو کہ سب کے سب آپس میں رشتہ دار تھے۔ سندھ کے دیہی علاقوں میں عموماً تمام قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہتے ہیں، اور آپس میں شادیاں بھی عام ہوتی ہیں۔ جس شخص کے نام پر یہ گاؤں تھا اس کے پاس 16 ایکڑ زمین تھی۔ پورا گاؤں سات ایکڑ زمین پر رہائش پذیر تھا جبکہ باقی ماندہ زمین زرعی پیداوار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ عورتوں کے مطابق یہ لوگ اس گاؤں میں اسی شخص کی صوابدید پر رہ رہے ہیں۔ اگر وہ شخص چاہے تو انہیں گاؤں چھوڑنے کا کہہ سکتا ہے۔

عورتیں زیادہ تر آس پاس کے گاؤں اور تقریباً تین سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع قریبی بازار تک پیدل ہی سفر کر لیا کرتی ہیں۔ چنگچی میں جانے کی صورت میں ایک طرف کا کرایہ 100 روپے (36 امریکی ڈالر) بنتا ہے۔ قریبی قصبہ (ٹنڈو محمد خان) جانے کے لیے آمد و رفت کا کرایہ 240 روپے (85 امریکی ڈالر) ہے۔ ایمر جنسی کی صورت میں عورتیں رکشہ لیتی ہیں جس کا دونوں طرف کا کرایہ تقریباً 1200 روپے (3 امریکی ڈالر) ہوتا ہے۔ عورتوں کے مطابق گزشتہ چند سالوں میں اشیاء کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اور ان کے لیے گزر بسر کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرا مسلمان گاؤں مولا بخش لاشاری بھی مرکزی سڑک سے کافی دور ہے۔ مرکزی سڑک سے گاڑی لینے کے لیے عورتوں کو پہلے تقریباً 2 کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔

حضور بخش گاؤں میں ایک عورت کی ایک ایکڑ زمین جو اس کے والد نے دی تھی، اس کے چچا نے زبردستی اپنے قبضہ میں لے لی۔ اس عورت کے ایک بیٹے کے پاس ایک رکشہ تھا جسے وہ ایک شوگر مل کے لیے گنا لوڈ کر کے ماہانہ 7 ہزار روپے (25 امریکی ڈالر) ہی کماتا تھا مگر یہ شوگر مل سال میں صرف تین ماہ ہی کام کرتی تھی۔ اس عورت کا دوسرا بیٹا ٹریکٹر ڈرائیور تھا لیکن اس کی موسمی آمدنی زمین کو زراعت کے لیے تیار کرنے کے دنوں میں دستیاب کام پر ہی منحصر تھی۔

پانچ بھائیوں میں سے ہر ایک کے پاس تقریباً 25ء 1 ایکڑ زرعی زمین تھی۔ ایک بھائی جو کراچی میں الیکٹریشن کا بھی کام کرتا تھا، اس نے خاندان کے دیگر افراد سے 3 ایکڑ زمین 25،000 روپے فی ایکڑ سالانہ کے حساب ٹھیکے پر لی ہوئی تھی جس پر وہ کپاس اور گندم کاشت کرتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھر کے مردوں کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے کسی زمیندار کی زمین پر مزدوری کرنے کے بجائے زرعی پیداوار سے متعلقہ دیگر کام خود گھر پر ہی کر لیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورتیں کڑھائی، رلیاں (روایتی بستر کی چادر) اور کپڑے سی کر اضافی آمدنی حاصل کرتی تھیں مگر اس گھریلو کام سے حاصل ہونے والی آمدنی بہت کم اور غیر یقینی تھی، عام طور پر مہینے میں ایک ہزار روپے سے بھی کم آمدنی ہوتی تھی۔

مولا بخش گاؤں میں بھی صورت حال تقریباً ایسی ہی تھی، بس فرق یہ تھا کہ وہاں زیادہ تر عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں جیسے کپاس چننا، مرچیں توڑنا یا دیگر زرعی کام۔ البتہ وہ صرف اتنی دوری پر جاتیں کہ اسی دن شام تک گھر واپس آسکیں۔ کپاس کی کاشت میں کمی کے باعث کپاس چننے

سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی کمی آگئی تھی۔ ایک عورت نے بتایا کہ اس نے ایک دن کی مزدوری 40 کلو گرام کپاس چننے کے عوض 400 روپے کمائی۔ مرچوں کے ایک تھیلے کی مزدوری 300 روپے تھی۔ یہ تمام کام موسمی تھے اور عام طور سے عورتوں کو ہر روز کام نہیں ملتا تھا۔ گندم کی کٹائی کی مزدوری زمین کے رقبے کے حساب سے ہوتی ہے۔ ایک ایکڑ کی کٹائی کے عوض 1ء5 من (60 کلو گرام) گندم ملتی ہے جو کہ ماضی میں 2ء5 من (100 کلو گرام) ہو کرتی تھی۔ اس علاقے میں تھر کے علاقے سے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے زیادہ تر مزدور آرہے ہیں۔ [جسکی وجہ سے مقامی عورتیں کے لیے کام کے مواقع مزید کم ہو گئے ہیں۔]

بجلی، گیس، پانی جیسے بنیادی ضروری وسائل اور سہولیات کی فراہمی نہیں تھی۔ کھانا پکانے کے لیے عورتیں کپاس کی فصل سے حاصل ہونے والی لکڑی کو جمع کرنے کے علاوہ مال مویشیوں کا گوبر بھی استعمال کرتی تھیں کیونکہ کھانا پکانے کے لیے دیگر ایندھن یا لکڑیاں خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ شادی بیاہ یا کسی اور خاص تقریب کے موقع پر لکڑیوں کو بازار سے خریداجاتا تھا مگر یہ بھی ان کا معمول نہیں تھا۔ مولا بخش گاؤں میں بھی عورتیں لکڑی کے بجائے زیادہ تر گوبر جلاتی تھیں۔ ان کے مطابق علاقے کے زمیندار انہیں لکڑی جمع کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بعض اوقات انہیں لکڑیاں جمع کرنے کے لیے کافی دور جانا پڑتا تھا جہاں سے وہ جھاڑیاں، ٹہنیاں یا سوکھے پیڑ کاٹ کر لاتی تھیں۔

حضور بخش گاؤں کی میٹھے پانی تک کوئی رسائی نہیں تھی جو پانی زمین سے پمپ کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا، وہ کھاراکھا اور پینے کے قابل نہیں تھا۔ گاؤں کا پانی آلودہ ہونے کی وجہ سے کئی لوگ معدے اور گردوں کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے اس لیے ڈاکٹروں اور طبی ماہرین نے گاؤں والوں کو بازار سے پانی خرید کر پینے کی تاکید کی تھی۔ متعلقہ خاندان موٹر سائیکلوں پر، جنہیں لوڈنگ (مال بردار) گاڑی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، بازار سے پانی خرید کر لاتے تھے۔ عام طور پر ایک گیلن پانی کی قیمت 20 روپے ہوتی ہے، اور ہفتے میں تقریباً 16 گیلن پانی، یعنی 320 روپے کا پانی استعمال کرتے تھے۔ مولا بخش گاؤں میں عورتیں ہینڈ پمپوں (زیر زمین) سے پانی حاصل کر رہی تھیں۔ کچھ عورتوں کے اپنے ہینڈ پمپ تھے جبکہ کچھ اپنے پڑوسیوں کے ہینڈ پمپ استعمال کر رہی تھیں۔ حضور بخش گاؤں کے برخلاف یہاں پانی پینے کے لیے قابل تھا۔ کپڑے دھونے کے لیے عورتیں نزدیکی ٹیوب ویل پر جاتیں تھیں۔ دونوں گاؤں میں عورتیں کھانا پکانے کے ایندھن اور پینے کے علاوہ دیگر استعمال کے پانی کے لیے خرچہ نہیں کرتی تھیں۔

زیادہ تر عورتوں کا کہنا تھا کہ وہ بمشکل اپنے خاندان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر پاتی ہیں جبکہ نئے کپڑے خریدنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ مولا بخش گاؤں میں تو صورت حال اور بھی زیادہ خراب تھی جہاں عورتیں اترن (استعمال شدہ پرانے کپڑے مانگ کر) پہنا کرتی تھیں۔ کئی عورتوں نے بتایا کہ ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک بھی کافی نہیں ہوتا۔ وہ سبزیاں (زیادہ تر ساگ، پالک) کھاتیں ہیں جو یا تو وہ خود اگاتیں ہیں یا دوسروں کی زمین سے مانگ کر یا چن کر لاتی ہیں۔ وہ آپس میں گندم یا دالیں ادھار لیتیں اور بعد ازاں اسی مقدار میں واپس کر دیتیں۔ کچھ عورتیں بازار سے بھی اناج یا دیگر راشن ادھار پہ خریدتیں مگر انہیں دکانداروں کی طرف سے ادھار چکانے پر مسلسل ہراسانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ زرعی مزدوری مل جانے کے بعد ہی وہ عام طور سے ادھار اتار دینے کے قابل ہوتیں۔

مولا بخش گاؤں میں ایک عورت نے بتایا کہ اُس کے بیٹے نے ایک زرعی بینک (بینک کے نام اور مقام سے ناواقف) سے ٹیوب ویل لگوانے کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے (500 امریکی ڈالر) کا قرضہ لیا تھا۔ آج دس سال بعد دو لاکھ روپے (714 امریکی ڈالر) واپس کرنے کے باوجود بھی پانچ لاکھ روپے (1,785 امریکی ڈالر) کا قرضہ باقی ہے۔ حضور بخش کی ایک طلاق یافتہ عورت نے بتایا کہ وہ صرف ایک بار احساس پروگرام کے تحت مدد حاصل کر سکی تھی، اور اُس کے بعد سے کوئی قسط نہیں ملی۔ تین عورتوں کو پہلے احساس پروگرام کے تحت سوشل سیفٹی نیٹ سپورٹ (سماجی تحفظ کی امداد) ملتی تھی لیکن اب بغیر کوئی وجہ بتائے وہ بند ہو چکی ہے۔ ہر تین ماہ میں 12 ہزار روپے ملا کرتے تھے جس میں سے پندرہ سو روپے افسر کمیشن (بطور رشوت) کاٹ لیتا تھا۔

حضور بخش گاؤں میں سوائے ایک یادو گھروں کے باقی عورتوں کے پاس اپنے مال مویشی نہیں تھے۔ زیادہ تر عورتیں مال مویشی دوسرے افراد کے لیے "نصف شراکت داری" کے تحت پالتی تھیں۔ عورتوں کی اکثریت مال مویشیوں کے لیے چارہ لینے جاتی تھیں۔ ان مویشیوں کی دیکھ بھال سے حاصل ہونے والی آمدنی گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یہی صورتحال مولا بخش گاؤں میں بھی تھی۔ عورتوں کے مطابق تقریباً تین سال تک جانور پالنے کے بعد ایک بچہ پیدا ہوتا تھا جسے فروخت کر کے دونوں فریقین رقم آدھی آدھی تقسیم کر لیتے ہیں۔ عموماً کم از کم تین سال بعد زیادہ سے زیادہ بیس ہزار روپے (71 امریکی ڈالر) کی آمدنی ہوتی تھی۔

حضور بخش گاؤں میں عورتیں زیادہ تر راشن بازار کی دکان سے لیتیں اور جو کچھ نقد میں ادا کر سکتیں، کردیتیں، باقی ادھار پہ گھر لے آتیں جس کی ادائیگی فصل کٹنے کے بعد کر دیا کرتی تھیں۔ عورتوں کی اکثریت گندم کی کٹائی کرنے کے بعد ضرورت کا گندم گھر میں ذخیرہ کر لیتی جو کہ پانچ سے چھ ماہ کے لیے کافی ہوتا۔ صرف ایک گھر میں شدید غذائی قلت کا سامنا تھا جہاں عورت آدھی روٹی کھا کر گزارا کر رہی تھیں۔ البتہ اب گاؤں والوں نے مل کر اس گھر کی دیکھ بھال شروع کر دی ہے اور خوراک کی فراہمی میں مدد کی جا رہی ہے۔ مولا بخش میں بھی کچھ عورتوں نے کہا کہ وہ بھی اکثر خوراک کی کمی کا شکار ہو جاتی ہیں کہ گھر میں کچھ بھی کھانے کو میسر نہیں ہوتا۔ دونوں گاؤں میں ماسوائے عید یاد یگر مذہبی تہواروں کے گوشت یا مرغی کا استعمال بالکل بھی نہیں ہوتا۔

گزشتہ سالوں میں کبھی حضور بخش گاؤں میں بجلی کی فراہمی ہوتی تھی مگر بلوں میں اضافے کے باعث ان کی ادائیگی محال ہو گئی اور بالآخر بجلی کی فراہمی منقطع کر دی گئی۔ پانچ سے دس ہزار روپے (18 سے 36 امریکی ڈالر) کے درمیان آنے والا بجلی کا بل اچانک سے بڑھ کر 40 ہزار روپے (143 امریکی ڈالر) تک جا پہنچا۔ عورتوں کے مطابق کوئی بھی شخص میٹر ریڈنگ کے لیے نہیں آتا تھا اور بل من مانی بنیادوں پر بھیج دیا جاتا تھا۔ بجلی کی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے پیش نظر ایک چھوٹا سولر پینل اور بیٹری خریدی گئی ہے جس کے ذریعے ایک بلب روشن کر لیا جاتا ہے۔ مولا بخش میں بھی تقریباً چار سال قبل تک بجلی موجود تھی مگر وہاں بھی بل اس حد تک بڑھ گئے کہ ادا کرنا ممکن نہ رہا۔ بل کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے سرکاری بجلی کمپنی نے آکر میٹر اتار لیے۔ اب وہاں بھی صرف ایک چھوٹا سولر پینل اور بیٹری موجود ہے جو محض بلب روشن کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

سرکاری پرائمری اسکول حضور بخش اور مولا بخش دونوں گاؤں سے خاصا دور واقع تھا۔ مولا بخش گاؤں سے اسکول کا فاصلہ تقریباً پانچ کلو میٹر تھا۔ دونوں گاؤں سے کئی لڑکے اسکول جا رہے تھے لیکن زیادہ تر صرف آٹھویں جماعت تک ہی پڑھ سکے تھے۔ شاذ و نادر ہی کسی نے دسویں جماعت مکمل کیا ہو۔ عورتوں کے مطابق پہلے اسکول سے کتابیں مفت فراہم کی جاتی تھیں لیکن اب یہ سہولت ختم ہو گئی ہے۔ مولا بخش گاؤں میں ایک عورت نے بتایا کہ اسکول میں صرف یونیفارم پہنے بچوں کو ہی بیٹھنے کی اجازت ہے بغیر یونیفارم کے بچے اسکول میں داخل نہیں ہو سکتے جو کہ تقریباً 1200 روپے تک کا آتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے بیٹے کا یونیفارم خریدنے کے لیے گھر کی ایک رلی (روایتی چادر) بیچ ڈالی۔ دونوں گاؤں میں لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پانچویں جماعت تک اسکول جاتی تھیں اور وہ بھی کسی بڑی عورت کے ہمراہ۔ عورتوں کے مطابق وہ لڑکیوں کو پانچویں جماعت کے بعد اسکول نہیں بھیجتیں کیونکہ اسکول کسی دوسرے گاؤں میں ہے۔ عورتوں نے کہا کہ اسکول میں تدریس کا معیار قدرے بہتر ہے۔

معمولی درد یا تکلیف کی صورت میں عورتیں طبی امداد یا علاج معالجہ نہیں کراتیں۔ ہاں مگر بیماری کی صورت میں وہ سرکاری اسپتال جاتی ہیں جہاں انہیں علاج اور ادویات کے لیے ادائیگی نہیں کرنی پڑتی تھی اور یہ دونوں سہولتیں بنامعاوضہ مہیا ہو جاتی تھیں۔ دونوں گاؤں کی عورتیں چنگچی لے کر سرکاری بنیادی طبی مرکز (BHU) جاتی ہیں، جو حضور بخش سے تقریباً چار کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور جس کا ایک طرف کا کرایہ تقریباً 100 روپے (36 امریکی ڈالر) ہے۔ دونوں گاؤں سے کرایہ کم و بیش ایک جیسا ہے۔ BHU سے مؤثر علاج نہ ہونے کی صورت میں وہ ٹنڈو محمد خان (TMK) کے بڑے فلاحی اسپتال جاتیں ہیں جو کہ حالیہ برسوں میں ہی قائم ہوا ہے اور عورتوں کے مطابق بہتر سروس فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ، خاص طور پر بچوں کے لیے، مفت ادویات بھی دیتا ہے۔ ٹنڈو محمد خان کے ہسپتال پہنچنے تک کا سفر چنگچی یا موٹر سائیکل پر کیا جاتا ہے جس میں تین سو سے لیکر پانچ سو تک کا خرچہ آتا ہے۔

عورتوں نے کہا کہ انہیں سرکاری اسپتال کے عملے کی طرف سے غیر انسانی اور ناروا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسپتال کا عملہ ان سے دور رہنے کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق عورتوں میں جراثیم ہوتے ہیں۔ حضور بخش گاؤں کی ایک عورت نے بتایا کہ اس کی بیٹی کو دل کا مسئلہ ہے جسے وہ ایک نجی اسپتال میں لے جاتی ہے۔ اسپتال جانے کے لیے موٹر سائیکل کا پیٹرول 500 روپے (8 امریکی ڈالر) اور ڈاکٹر کی فیس بھی 500 روپے (8 امریکی ڈالر) ہے جو کہ اسے بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ادویات اپنا اثر نہیں دکھا رہی اور اس کی بیٹی کی طبیعت نہیں سنبھل رہی۔

حضور بخش گاؤں میں زیادہ تر مرد مکینک، ڈرائیور یا زرعی مزدور کے طور پر کام کر رہے تھے۔ کسی کے پاس مستقل روزگار نہیں تھا۔ گاؤں کا ایک مرد کسی اور کی کیلے کی فصل کی دیکھ بھال کر رہا تھا، جس کے بدلے اسے سالانہ ایک لاکھ روپے (357 امریکی ڈالر) ملتے تھے۔ مولا بخش کے زیادہ تر مرد زرعی مزدور تھے۔ حضور بخش کی طرح یہاں کے مرد بھی دور جا کر روزگار تلاش نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس کوئی خاص ہنر نہیں ہے اور وہ روزگار حاصل نہیں کر پائینگے۔ صرف ایک گھر ایسا تھا جہاں کا ایک فرد مسلح افواج میں ملازم تھا۔ یہ گھر انہ دوسرے خاندان کے مقابلے میں بہتر حالات میں تھا کیونکہ وہ تسلسل کے ساتھ آمدنی گھر بھیج رہا تھا۔ عورتوں کے مطابق کراچی میں رہنے والا الیکٹریشن بھی مستقل کام نہ ہونے کی وجہ سے اب بہتر روزگار کی تلاش میں دبئی جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

دونوں گاؤں کی عورتوں کے مطابق گزشتہ چار پانچ سالوں میں بنیادی ضروریات زندگی کے اخراجات میں اضافہ ہوا ہو، خاص طور پر خوراک مثال کے طور پر گندم کا آٹا اور چینی کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔ اسی لیے اب اشیائے خورد و نوش کی کمی کے باعث دن میں دو بار سے زیادہ کھانا پکانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ خوراک کی مقدار بھی پہلے سے کم ہو گئی ہے۔ کم کھانا پکانے کی وجہ سے ان کو اب گھر میں کام بھی کم لگنے لگا ہے۔ عورتوں نے مزید کہا اس کے علاوہ دیگر اضافی آمدنی بھی پہلے کے مقابلے میں کافی کم ہو گئی ہے۔ اب کشیدہ کاری کا کام بھی کافی حد کم ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر عورتیں افسردہ تھیں اور ان کے لیے عذاب مسلسل کی طرح زندگی گزارنا دشوار ہو گئی ہے۔ بہر کیف وہ گھر میں جھگڑا کرنے سے گریز کرتی ہیں اور جو کچھ میسر ہے، اسی میں گزارا کرنے پر مجبور ہیں۔

ہندو گاؤں

تحقیق کے لیے دو مزید فوکس گروپ ہندو آبادیوں میں کیے گئے۔ ایک ویری گوٹھ جو کہ ضلع ٹنڈو محمد خان میں واقع ہے۔ ویری گوٹھ میں کولی ذات کے ہندو مقیم تھے جو زرعی پیداوار کے متعلقہ کام کرنے کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ دوسرا گروپ ضلع بدین میں موجود سیل گام گاؤں میں منعقد ہوا جو کہ بھیل برادری کا گاؤں ہے۔ یہاں کے لوگ زرعی مزدور تھے۔ ویری گوٹھ ایک پختہ سڑک کے ساتھ واقع تھا جو اس علاقے کا مرکزی راستہ تھا جبکہ سیل گام مرکزی سڑک سے کم از کم 2 سے 3 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ماتلی بائی پاس کے قریب ایک چھوٹے سے اسٹاپ سے منسلک تھا۔ اس علاقے میں کوئی باقاعدہ بازار موجود نہیں تھا لیکن پھل اور سبزی بیچنے والے بائی پاس روڈ پر مل جاتے تھے۔ ماتلی شہر ان گاؤں سے کوئی چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ سیل گام سے قریبی شہر تک جانے کے لیے عورتیں مرکزی سڑک تک پیدل چل کر جاتیں ہیں اور پھر وہاں سے چنگچی استعمال کرتی ہیں جو ان سے فی کس 150 روپے کرایہ لیتا ہے۔ قریبی شہروں تک جانے کے لیے یہی عام کرایہ تھا۔ ویری گوٹھ میں قریبی بازار تک سفر کا کرایہ 20 روپے جبکہ ٹنڈو محمد خان شہر جانے کا ایک طرفہ کرایہ 100 روپے تھا۔

ویری گوٹھ میں بیشتر گھروں کی معاشی حالات کافی خراب تھے کیونکہ وہ جاگیر دار کی زمین پر مزدوری کرتے تھے جو اس علاقے کی زیادہ تر زمین کا مالک تھا۔ جو بھی کام عورتیں کر سکتی تھیں یا جو بھی کام ان کو ملتا، فوراً لے لیا کرتی تھیں جن میں کپاس کی چنائی اور گندم اور چاول کی کٹائی بھی شامل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مال مویشی بھی شراکت داری میں پالتی تھیں۔ قریبی علاقوں کی زمینوں میں کام کرنے کے علاوہ ضلع کے اندر دیگر دور دراز کے علاقوں میں بھی اور ضلع سے باہر دوسرے اضلاع میں بھی مل جل کر کام کرنے جاتیں۔ سفر کے لیے وہ کرائے کی گاڑی، زیادہ تر لوڈنگ گاڑی استعمال کرتیں اور کرایہ آپس میں بانٹ لیتیں۔ وہ ٹنڈو محمد خان کے دیگر علاقوں، یا دوسرے اضلاع جیسے بدین، خیرپور اور سجاول تک بھی سفر کرتیں۔ نقد آور فصلیں جیسے کہ گنے کی فصل میں کام کرنے کے عوض انہیں نقد رقم کی صورت میں معاوضہ ملتا جبکہ خوراک کی فصلوں میں کام کرنے کے عوض انہیں معاوضہ اجناس کی شکل میں ملتا۔ 40 کلو گرام کپاس چننے کا معاوضہ 800 روپے تھا لیکن اپنے مال مویشیوں کے چارہ کے لیے زمیندار کی زمین سے گھاس بھی لینے کی صورت میں اسی مقدار میں کپاس چننے کے عوض 400 روپے دیئے جاتے ہیں۔ اگر دو عورتیں اکٹھے کام کریں تو عام طور سے وہ ایک دن میں 40 سے 80 کلو کپاس چن لیتی ہیں۔

ٹنڈو محمد خان میں ایک عورت نے اپنے تین بیٹوں کو گولارچی، بدین میں چاول کی کٹائی کے لیے بھیجا تھا۔ انہیں اجناس کی صورت میں ادائیگی ملی، اور وہ 30 من (1200 کلوگرام) چاول کما کر واپس آئے، جو ان کے گھرانے کے لیے تقریباً تین سے چار مہینے کا ذخیرہ تھا۔ ایک اور عورت اپنی چار بیٹیوں کے ساتھ ٹنڈو محمد خان کے چاول اگانے والے علاقے میں فصل کی کٹائی کے لیے گئی تھیں۔ وہ صرف 10 من (400 کلوگرام) چاول لاسکیں کیونکہ اجرت کا کچھ حصہ ان کے اخراجات کے طور پر رکھ لیا گیا اور کچھ انہوں نے وہیں کھالیا۔ اس عورت کا شوہر معذور تھا اور صرف محدود کام کر سکتا تھا، جیسے کہ مال مویشیوں کے لیے گھاس کاٹنا وغیرہ۔ یہ عورت کپاس بھی چنتی تھیں اور 20 سے 40 کلوگرام کپاس کے عوض 300 سے 600 روپے کما لیتی تھیں۔ پچھلے سیزن میں انہوں نے مجموعی طور پر 200 کلوگرام گندم کمائی تھی۔ ایک ایکڑ زمین کی کٹائی پر اجرت کے طور پر 15ء من (60 کلوگرام) گندم دی جاتی تھی، جو پانچ افراد کے گھرانے کے لیے تقریباً ایک ماہ کی خوراک کے لیے کافی ہوتی تھی۔

تمام گاؤں کی عورتوں، چاہے مسلمان ہوں یا ہندو، نے کہا کہ ماضی میں ایک ایکڑ زمین کی گندم کی کٹائی پر 25ء من (100 کلوگرام) گندم دی جاتی تھی۔ مگر حالیہ برسوں میں یہ پہلے 2 من اور اب صرف 15ء من رہ گئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دیگر علاقوں جیسے تھر سے مزدوروں کی آمد کا سلسلہ کافی بڑھ گیا ہے، جس کے باعث مزدوری میں کمی آئی ہے۔ مقامی جاگیر دار بھی مقامی افراد کے بجائے دور دراز سے آنے والے مزدوروں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ایک بیوہ عورت، جو اپنے دو شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہتی تھیں، گندم کی کٹائی کے لیے جاتی تھیں۔ وہ کپاس چننے اور چاول کی کٹائی کا کام بھی کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی بہوؤں کے ساتھ مل کر پچھلے سیزن میں 400 کلوگرام گندم کمائی، جو چار مہینے کے لیے کافی تھی۔ یہ تمام کام موسمی نوعیت کے تھے، چاہے کپاس کی چنائی ہو، چاول کی کٹائی ہو (جن کا موسم آپس میں تھوڑا سا میل کھاتا ہے)، یا گندم کی کٹائی ہو، ہر فصل کا کام صرف دو سے ڈھائی ماہ تک ہی دستیاب ہوتا ہے۔ ویری گوٹھ میں عورتیں جاگیر دار کے لیے بھی مال مویشی آدھے کی شراکت داری میں پالتی تھیں۔ وہ مویشیوں کی فروخت پر آدھی قیمت حاصل کرتیں، اور اگر جانور کے دو بچے ہوتے، تو انہیں جاگیر دار کی جانب سے ایک بچہ رکھنے کی بھی اجازت ہوتی۔ بصورت دیگر عام رواج تھا کہ بچہ بیچ کر دونوں فریق نصف قیمت تقسیم کر لیتے۔ ایک عورت نے کہا کہ:

"ہم اپنی خوراک کے لیے مزدوری کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی شادیوں کے لیے مال مویشی پالتے ہیں۔"

سیل گام میں ایک خاندان آدھی حصہ داری پر بطور مزارع کام کر رہا تھا جبکہ تین مزارع ایک چوتھائی کی حصہ داری پر دو مختلف زمینداروں کی زمین پر کام کر رہے تھے جن کے پاس تقریباً 25 ایکڑ زمین تھی۔ مزارعین کو عام طور پر 3 سے 14 ایکڑ زمین دی جاتی تھی، جو مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہوتی تھی، اور ہر چند سال بعد زمین کا ٹکڑا بدل دیا جاتا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر خاندان زمینداروں کے مقروض تھے۔ فصل کی کٹائی کے بعد زمیندار ان کے حصے سے ان کے حصے میں آنے والی پیداواری لاگت اور سال بھر لیا گیا قرضہ وصول لیتا تھا۔ 2022 کے سیلاب میں چاول کی فصل مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھی لیکن مزارع اب تک پچھلا قرض اتار رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ 2022 کے سیلاب کے بعد حکومت نے فی ایکڑ 5000 روپے دیے تھے جو زمینداروں نے خود رکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ زمینداروں نے حکومت سے مزید 60 ہزار روپے فی ایکڑ حاصل کیے مگر مزارعوں کو اس امدادی رقم سے ایک پانی تک نہیں ملی۔

چاول کی فصل کی کٹائی میں تمام اخراجات مزارع کے حصے سے نکالنے کے بعد زمیندار نے انہیں ان کی مزدوری کے عوض صرف 400 کلوگرام ہی چاول دیے۔ مزید حق مانگنے پر انہیں زمیندار کی جانب سے قرضہ واپس کرنے یا گھر خالی کرنے کی دھمکیاں ملتی ہیں۔ عورتوں نے بتایا کہ گندم کی کٹائی کے لیے جانے والے ایک خاندان کو گھر میں ہو جانے والی ایک موت کی وجہ سے اچانک واپس آنا پڑا تو زمیندار نے اس خاندان کے ایک فرد کو تا ادائیگی قرضہ اپنے پاس روک لیا اور انتقال میں بھی شامل ہونے نہیں دیا۔ ایک گھرانے نے تقریباً تین سال پہلے بیس ہزار روپے قرضہ لیا تھا۔ اگرچہ یہ قرضہ واپس کر دیا گیا مگر انہیں زبردستی دوسرا قرض لینا پڑا اور تب سے زمیندار ان کی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ مزید یہ کہ اس خاندان کے ایک فرد نے اس زمیندار کے پاس ماہانہ تنخواہ پر ملازمت کر لی، اب اس کی تنخواہ کا بھی ایک حصہ زمیندار اپنے پاس روک لیتا ہے۔ عام طور پر زمیندار کا قریبی پرچونیہ کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے مزارعین اشیاء کے عوض نقد ادائیگی نہ کر سکیں تو وہ اس دکان سے زمیندار کی دستخط شدہ پرچی کی بنیاد پر آٹھ سو سے ہزار روپے تک کا سامان ادھار لے سکتے ہیں۔ زمیندار یہ رقم فصل کٹائی کے وقت کاٹ لیتا ہے۔ زرعی مزدور بھی یہ سہولت حاصل کر سکتے تھے، لیکن انہیں زمیندار کی زمین پر اضافی محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔

زمیندار گاؤں والوں کو دوسرے لوگوں کے جانور حصہ داری میں پالنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ صرف اپنے ہی جانور رکھنے کی اجازت دیتا تھا، جن میں وہ نصف شراکت داری رکھ سکتے تھے۔ اگر اچانک کوئی بیماری یا مجبوری آ جاتی، تو لوگ اپنے حصے کے جانور زمیندار کو ہی واپس بیچ دیتے تھے۔ آمدنی کے ان محدود ذرائع کی وجہ سے ان خاندانوں کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ اکثر اوقات انہیں بھوکے رہنا پڑتا، نئے کپڑے نہیں خرید سکتے تھے، اور طبی معائنے اور علاج معالجہ بھی ترک کرنا پڑتا تھا۔ گاؤں میں موجود خاندان آپس میں چاول یا آٹا بطور ادھار لیتے دیتے تھے، لیکن یہ لین دین اس بات پر منحصر ہوتا تھا کہ قرض لینے والا واپس کرنے کی گنجائش رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک ایسے خاندان کا بھی ذکر ہوا جس کا واحد مرد عادتاً کام نہیں کرتا تھا اور لیا ہوا قرضہ واپس نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے باقی خاندانوں نے اس کی مدد کرنا بند کر دی تھی۔

عورتوں کا کہنا تھا کہ پچھلے چار سے پانچ سالوں میں روزمرہ استعمال کی اشیاء بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں مزدوری بھی دستیاب نہیں، جس سے ان کی مشکلات اور مالی عدم تحفظ میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ سیل گام اور ویری گوٹھ کی عورتوں کے مطابق وہ گھر کا راشن ماہانہ بنیادوں پر نہیں خریدتیں بلکہ روزانہ کی ضرورت کے لئے جو خرید پاتی ہیں، خرید لیتی ہیں اور اسی میں گزارا کر لیتی ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خرچہ آٹا، خوردنی تیل اور چینی کا ہوتا ہے۔ پورا سال ان کا اسی فکر میں گزرتا ہے کہ ان سمیت ان کے خاندان بھر کی کم از کم ضروری خوراک کا مناسب بندوبست ہو سکے۔

اگرچہ زیادہ تر عورتیں مذہبی وجوہات کی بنا پر گوشت نہیں کھاتیں لیکن گوشت ان کی پہنچ سے ویسے بھی باہر ہے۔ ان کے مطابق ہر چیز بہت مہنگی ہو چکی ہے۔ سیل گام کی عورتوں نے بتایا کہ وہ سال میں صرف ایک جوڑا لباس ہی خرید پاتی ہیں۔ سردیوں کے علاوہ، جب سبزیاں زیادہ مقدار میں دستیاب ہوتی ہیں، ان کے روزمرہ کے کھانے میں عموماً روٹی اور پیاز یا لال مرچ ہی ہوتی ہے۔ یوں تو سب کو ہی دائمی بھوک کا سامنا ہے، لیکن عورتوں کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے کیونکہ وہ مردوں اور بچوں کو کھلانے کے بعد ہی کچھ کھاتی ہیں۔ دو خاندانوں نے بتایا کہ ان کی بیٹیاں بیاہ کے قابل ہیں لیکن وہ ان کی شادی کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

ویری گوٹھ میں ایک عورت نے بتایا کہ اگر موسمی (سیزن) کام دستیاب نہ ہو تو اس کے بیٹوں کو اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ جہاں ہر بیٹا بھٹے کے دو ہزار روپے (7 امریکی ڈالر) کماتا ہے۔ یہی صورت حال گاؤں کے بیشتر گھروں میں معمول کی بات تھی۔ خاندان کو شش کرتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو بیٹوں کو قریبی شہروں میں کام پر بھیج دیں۔ ایک عورت کے خاندان میں سات افراد تھے۔ اس نے اپنا ایک بیٹا حیدر آباد شہر (تقریباً چار گھنٹے کی دوری پر) بھیجا، جہاں وہ ایک فیکٹری میں دالیں چھاننے اور بوریاں گاڑیوں میں لوڈ کرنے کا کام کرتا ہے۔ وہ دیہاڑی پر تقریباً 80 روپے فی گھنٹہ کے حساب سے کام کرتا ہے۔ اس طرح وہ روز کے 800 سے 1000 روپے تک کمالیتا ہے۔ اپنے ذاتی اخراجات نکال کر وہ ہر ماہ تقریباً 5,000 سے 10,000 روپے گھر بھیجتا ہے۔ وہ حیدر آباد میں اپنی شادی شدہ بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ متعدد مرد چنگچی یا رکشہ چلاتے ہیں؛ ایندھن کے اخراجات کے بعد وہ روزانہ تقریباً 500 روپے تک کمالیتے ہیں جو کہ یقیناً مسافروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ ایک عورت کا بیٹا ایک غیر سرکاری فلاحی ادارے کے اسکول سے غیر رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری اسکول میں داخلہ لے کر مزید تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اب ایک دوسرے غیر سرکاری فلاحی ادارے میں کام کر رہا ہے اور گھر کے راشن کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ذیابیطس اور گردوں کی بیماری میں مبتلا والدین کے علاج معالجہ کی بھی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔

گاؤں میں نہ گیس ہے اور نہ ہی بجلی۔ کم از کم چالیس سال پرانے ان دونوں گاؤں میں بجلی کی سہولت موجود نہیں ہے۔ ویری گوٹھ کی صورت حال خاص طور پر چونکا دینے والی ہے کیونکہ یہ ایک کچی سڑک کے ساتھ واقع ہے اور گاؤں میں ایک بجلی کا کھمبا ہونے کے باوجود بھی وہ اس میں سے ایک غیر قانونی کنڈہ ڈالنے سے بھی کتراتے ہیں۔ چونکہ وہ مذہبی لحاظ سے ہندو اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے اپنے خلاف کارروائی ہو جانے سے خوفزدہ ہیں۔ کچھ گھروں میں چھوٹی بیڑیوں کے ساتھ سولر پینل لگے ہوئے ہیں۔ سیل گام گاؤں میں صرف ایک گھر میں ایک چھوٹا سولر پینل موجود تھا۔

کسی بھی گاؤں میں نلکوں کے ذریعے پانی کی فراہمی نہیں تھی۔ ویری گوٹھ میں زیر زمین پانی کے انتہائی کھارا ہونے کی وجہ سے ہینڈ پمپ بھی نہیں لگائے جاسکتے تھے۔ کوئی 20 سے 30 منٹ کے پیدل فاصلے پر ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے جہاں سے عورتیں اپنے سر پر رکھ کر پانی لاتی ہیں اور اگر یہ ہینڈ پمپ خراب ہو جائے تو گاؤں والے چندہ کر کے اس کی مرمت کرواتے ہیں۔ سیل گام گاؤں میں چار ہینڈ پمپ لگے ہوئے ہیں جس کو سب مل کر ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے بھی صرف دو کا ہی پانی پینے کے قابل ہے جبکہ باقی دو کا پانی کھارا ہے۔ کپڑے دھونے کے لیے عورتیں قریبی نہر پر جاتی ہیں۔ سیل گام میں زمیندار نے اپنی زمین پہ بجلی کے کھمبے لگنے نہیں دیئے کیونکہ اگر کھمبے لگ جاتے تو زمین کا وہ حصہ سرکاری تحویل میں چلا جاتا۔ ایندھن کے لیے دونوں گاؤں میں جانوروں کا گوبر استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ارد گرد کے علاقوں سے لکڑیاں بھی جمع کی جاتی تھیں۔ تاہم زمین دار لکڑی جمع کرنے کی بھی محدود اجازت دیتے تھے۔

مسلمان گاؤں کی طرح ان گاؤں میں بھی معمولی بیماریوں کی صورت میں طبی مراکز نہیں جایا جاتا تھا۔ ویری گوٹھ میں لوگ چھوٹی مسافر گاڑی جسے عام طور پر سوزوکی کہا جاتا ہے، کے ذریعے ٹنڈو محمد خان شہر کے نجی ہسپتال میں یا قریبی بنیادی صحت مراکز تک جاتے تھے جو کہ تین سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ وہی طبی مراکز ہیں جن کا ذکر اوپر حضور بخش اور مولا بخش گاؤں کے لیے کیا گیا تھا۔ زچگی کے لیے عورتیں عموماً ٹنڈو محمد خان شہر

کے نجی کلینک کو ترجیح دیتی تھیں کیونکہ وہ سرکاری سہولیات کے مقابلے میں بہتر تصور کیے جاتے تھے۔ صرف کلینک تک پہنچنے کا کرایہ ہی دو سے ڈھائی ہزار روپے (7 سے 9 امریکی ڈالر) تھا۔ اگر نارمل ولادت ہو تو گاؤں میں ہی کی جاتی ورنہ پیچیدگیوں کی صورت میں عورتوں کو ٹنڈو محمد خان یا ماتلی کے نجی زچہ خانوں میں منتقل کیا جاتا۔ عورتوں کے مطابق سرکاری اسپتال میں زچگی کی مناسب سہولتیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ ماں کو وہاں نہیں لیکر جاتے۔ شہروں میں اکثر آپریشن کر دیے جاتے ہیں جس کی لاگت تقریباً 25 ہزار روپے (89 امریکی ڈالر) آتی جبکہ قدرتی ولادت کا خرچہ تقریباً 15 ہزار روپے (54 امریکی ڈالر) ہوتا ہے۔ سیل گام میں اگر کسی مریض کو اسپتال لے جانا پڑتا تو ایک گاڑی کرائے پر لی جاتی جس کا کرایہ عموماً ایک ہزار سے بارہ سو روپے (36 امریکی ڈالر سے 42 امریکی ڈالر) ہوتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں بیماری کی صورت میں ماتلی کے سرکاری اسپتال جاتی تھیں کیونکہ وہ نجی اسپتال یا کلینک کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

ویری گوٹھ میں بچے سرکاری اسکول میں داخل تھے مگر اساتذہ شاذ و نادر ہی اسکول آتے تھے اور جب آتے بھی تھے تو بچوں پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ اسکول کی دوری اور عورت استاد کی غیر موجودگی کی وجہ سے لڑکیاں تعلیم حاصل نہیں کر پا رہی تھیں۔ دوسری طرف سیل گام گاؤں میں بچے پیدل چل کر اسکول جاتے تھے مگر وہاں تعلیم پر توجہ ویری گوٹھ کے اسکولوں سے بھی کم تھی۔ عورتوں کے مطابق فصل کی کٹائی کے دوران دور دراز علاقوں میں مزدوری کی خاطر نقل مکانی کی وجہ سے بچوں کو تسلسل کے ساتھ اسکول بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ سیل گام کے بیشتر خاندان سال میں سات سے آٹھ ماہ کھیت مزدوری کے لیے گاؤں سے باہر رہتے تھے۔ وہ مزدوری کے سلسلے میں سندھ کے مختلف اضلاع کے ساتھ ساتھ پنجاب میں بھی گئے کی فصل کی کٹائی کے لیے جاتے تھے۔

عام طور پر عورتوں کا کہنا تھا کہ وہ مہنگائی کی اصل وجہ تو نہیں جانتیں لیکن وہ حکومتی اہلکاروں کو بد عنوان اور رشوت خور ضرور قرار دیتی تھیں۔ دونوں ہندو بستیوں کی عورتیں حکومت کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی تھیں تاکہ مہنگائی خاص طور پر خوراک، آمدورفت اور ایندھن کی قیمتوں میں کمی کرنے کا مطالبہ کیا جاسکے۔ تمام گاؤں میں عورتیں کسی بھی قسم کی فیصلے سازی میں شامل نہیں تھیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنی ہی برادری میں رہ رہی تھی اس لیے خود کو غیر محفوظ نہیں تصور کرتی تھیں۔ سیل گام میں مرد حضرات برادری میں ہونے والے کسی مسئلہ کا سامنا کرنے کی صورت میں زمیندار سے بھی ثالثی کر لیتے تھے۔

ویری گوٹھ میں کوئی بھی عورت یا خاندان حکومت کی طرف سے کسی بھی قسم کی سماجی تحفظ کی اسکیم سے مستفید نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ ایک مائیکروفنانس ادارہ، نیشنل رورل سپورٹ پروگرام (NRSP) یہاں کام کر رہا تھا۔ یہ ادارہ سالانہ بلا سود کے 10,000 روپے کا قرضہ دینے سے شروعات کرتا ہے جسے بارہ مہینے میں واپس کرنا ہوتا ہے۔ اگر مقررہ وقت پر قرضہ واپس نہ کیا جائے تو مقرض کو 400 روپے سے 500 روپے اضافی جرمانہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ تین سال کی اچھی کارکردگی دکھانے والے افراد کو مزید قرضہ مل سکتا ہے۔ یہ سہولت اس لیے میسر تھی کیونکہ گاؤں کا ایک نوجوان NRSP میں کام کر رہا تھا۔ زیادہ تر لوگ نقدی پر ہی سودا سلف خریدتے تھے اور قرض سے گریز کرتے تھے۔ بہت مجبوری میں زیادہ سے زیادہ تین سے چار دن کے ادھار پر سامان لیا جاتا اور جلد از جلد مقررہ وقت میں قرضہ لوٹا دیا جاتا۔

سیل گام گاؤں میں تقریباً بیس عورتیں بینظیر انکم سپورٹ پروگرام سے مالی امداد حاصل کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں بچوں کو بھی حکومت کی طرف سے احساس ایمر جنسی پروگرام کے تحت وظیفہ مل رہا تھا۔ لڑکوں کو 3،000 روپے اور لڑکیوں کو 3،500 روپے دیے جا رہے تھے۔ تین خاندان ان بچوں کے وظیفوں سے مستفید ہو رہے تھے۔ تاہم عورتوں نے بتایا کہ یہ رقم حاصل کرنے کے لیے انھیں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی حکام کو رشوت دینی پڑتی ہے۔ عورتوں کے مطابق انھیں دی جانے والی امدادی رقم وصول کرنے کے لیے 1,800 روپے تک کی کٹوتی کروانی پڑتی ہے۔ جیسا کہ مسلمان گاؤں سے رپورٹ کیا گیا تھا۔

فوکس گروپ بات چیت کے دوران سفارشات

ہر فوکس گروپ کے اختتام پر شریک عورتوں کی جانب سے کچھ تجاویز پیش کی گئیں۔ سب سے زیادہ آواز اس بات کے لیے اٹھائی گئی کہ حکومت محصولات میں کمی کرے، گیس، بجلی اور ٹرانسپورٹ کے نرخ کم کرے، آسان شرائط پر بلا سود قرضے فراہم کرے، اسکولوں میں قابل اساتذہ تعینات کیے جائیں اور طبی سہولیات کو بہتر بنایا جائے۔

عورتوں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ حکومت بنیادی اشیائے خورد و نوش، خصوصاً آٹے، کھانے کا تیل (کوکنگ آئل)، چائے اور چینی کی قیمتوں میں کمی کرے۔ بار بار اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں کئی گنا بڑھ گئی ہیں لیکن اجرتیں وہی کی وہی ٹھہری ہوئی ہیں۔ عورتوں کی طرف سے اٹھایا گیا اہم نکتہ یہ تھا کہ حکومت کی جانب سے عائد کیے گئے بھاری ٹیکس ان کے مسائل میں اضافے کا سب سے اہم موجب ہے۔ شہری علاقوں کی عورتوں نے آمدورفت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی بھرپور شکایت کی، جو ان کی ناگزیر ضرورت ہے۔ کچھ عورتوں کو اس بات کا بھی ادراک تھا کہ حکومت نے جو بھاری شرح سود پر قرضے لیے ہیں، ان کا بوجھ عوام پر محصولات کی صورت میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان کے مطابق عوام وہ قرضہ لوٹا رہی ہے جو اس نے لیا بھی نہیں ہے۔

شہری عورتوں نے مطالبہ کیا کہ تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور بند کارخانے دوبارہ کھولے جائیں تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی مستقل روزگار مل سکے۔ انھوں نے بہتر سیاسی قیادت کی بھی ضرورت پر بھی زور دیا اور یہی مطالبہ دیہی علاقوں میں بھی کیا گیا۔ دیہی عورتوں نے خاص طور پر اس بات کا مطالبہ کیا کہ انھیں مولیشی فراہم کیے جائیں، کیونکہ یہ ان کی بہتر آمدنی کا مستقل اثاثہ بن سکتے ہیں اور بچوں کی پرورش میں بھی مددگار ثابت ہوں گے۔ دیہی علاقوں میں باہمی مدد اور برادری یکجہتی کا مضبوط تصور پایا گیا جو ان کی زندگی کے معمولات کو قائم رکھنے میں ایک ستون کی مانند ہے۔

ویری اوڈجو کوٹ ہندو کو لی برادری کا ایک گاؤں ہے جس کی کل آبادی تقریباً 700 افراد پر مشتمل ہے۔ یہاں تقریباً 100 گھرانے آباد ہیں۔ ان میں سے 15 خاندان کئی سالوں سے وڈیروں کی زمینوں پر بطور ہاری کام کر رہے ہیں جبکہ باقی مزدور یومیہ اجرت پر کھیت مزدوری کرتے ہیں۔

ایک خاندان، جس میں 18 افراد شامل ہیں، کئی سالوں سے ایک جاگیر دار کی زمین پر بطور ہاری کام کر رہا تھا۔ لیکن اب زمیندار نے مطالبہ کیا ہے کہ وہ چار ایکڑ زمین کی تمام پیداواری لاگت خود اٹھائیں۔ حالانکہ روایتی طور پر یہ لاگت زمیندار اور ہاری کے درمیان برابر تقسیم ہوتی ہے۔ خاندان کے مطابق یہ اخراجات برداشت نہ کرنے کی وجہ سے زمین ان سے واپس لے لی گئی۔ اس سال وہ خاندان صرف مزدور کے طور پر کام کر رہا ہے۔

موجودہ گندم کی کٹائی کے سیزن (اپریل تا مئی 2024) میں اس عورت کاشوہر، دو بیٹے اور بہوئیں اپنے گاؤں سے تقریباً 300 کلومیٹر دور پانچ گھنٹے کی مسافت طے کر کے ضلع خیرپور میرس کے علاقے دیوان شاخ، کوٹری محمد کبیر کے علاقے گئے۔ گاؤں سے مجموعی طور پر 22 افراد گئے تھے جن میں 9 عورتیں اور 13 مرد شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ تر میاں بیوی تھے جس میں مذکورہ خاندان کے پانچ افراد اس قافلے کا حصہ تھے۔ انھیں یہ کام زبانی کلام و رابطے کے ذریعے ملا تھا۔ ایک طرف کا کرایہ 50 ہزار روپے (179 امریکی ڈالر) تھا جو کہ انہوں نے ادا کیا اور واپسی کا کرایہ کام دینے والے زمیندار نے ادا کیا جس کی کل زمین 25 ایکڑ تھی۔

یہ لوگ 45 دن کی مزدوری کے بعد ویری گوٹھ واپس لوٹے۔ ان کے علاقے میں گندم کی کٹائی کا معاوضہ فی ایکڑ ڈیڑھ من ہوتا ہے، لیکن خیرپور میں یہ معاوضہ ڈھائی سے تین من فی ایکڑ تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو فصل ابھی تیار نہیں ہوئی تھی لہذا انہیں 15 دن انتظار کرنا پڑا۔ مذکورہ خاندان کے مطابق وہ پہلے سے جانتے تھے کہ فصل ابھی تیار نہیں ہوئی ہے لیکن زمیندار نے انہیں جلدی اس لیے بلایا تا کہ فصل کی کٹائی کے لیے مزدوروں کی موجودگی کو یقینی بنا سکے۔ وہ ایک طرفہ کرایہ پہلے بھیجنے سے بھی کتر رہا تھا۔ زمیندار نے انہیں رہنے کے لیے بیٹھک مہیا کی جہاں پورے 22 افراد ایک ساتھ مقیم رہے۔ البتہ اپنے کھانے کا انتظام انہیں خود کرنا پڑا اور پانی بینڈ پمپ کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا۔

قیام کے دوران انہوں نے کئی 4 سے 7 ایکڑ والے چھوٹے زمینداروں کے لیے بھی مزدوری کی۔ انہوں نے مجموعی طور پر 50 ایکڑ زمین کی گندم کاٹی۔ 25 ایکڑ پر انہیں 25 من (100 کلو گرام) فی ایکڑ کے حساب سے 625 من (2،500 کلو گرام) گندم ملی، جبکہ بقیہ 25 ایکڑ پر 3 من (120 کلو گرام) فی ایکڑ کے حساب سے 75 من (3،000 کلو گرام) گندم ملی۔ یوں اجرت کی مد میں کل 1375 من (5،500 کلو گرام) گندم حاصل ہوئی جسے 10 خاندانوں کے 22 افراد نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ قیام کے دوران جو اخراجات آئے، وہ انہیں اپنی کمائی میں سے ہی ادا کرنے پڑے۔ واپسی پر انہیں گندم ساتھ لانے کے لیے ایک ٹرک کرایہ پر لینا پڑا جس کا کرایہ 50،000 روپے تھا، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ خیرپور میں قیام کے دوران انہیں کپاس چننے کے لیے اگلے سیزن میں دوبارہ آنے کی پیشکش بھی ہوئی۔ ان 22 افراد (10 خاندان) میں شامل اس مذکورہ خاندان کو 1375 من گندم میں سے مجموعی طور پر 231 من گندم ملی جس میں سے 6 من گندم کرایہ اور وہاں رہنے کے اخراجات میں خرچ ہوئے۔ باقی 25 من گندم یہ خاندان

45 دن کی اجرت کے طور پر گھر لے آیا۔ ان کے مطابق یہ مقدار ان کے 18 افراد پر مشتمل خاندان کے لیے تقریباً 5 سے 6 ماہ کی خوراک کے لیے کافی ہوگی۔ اس کے بعد وہ چاول کی فصل کی کٹائی کے لیے کام کی تلاش کریں گے تاکہ بقیہ سال کی خوراک کا بھی بندوبست کر سکیں۔

کیس اسٹڈی 2

سونی بھیل، ایک 60 سالہ بیوہ عورت، پہلے ضلع ٹنڈو محمد خان کے ایک گاؤں امر و بھیل میں رہتی تھی جو سیل گام گاؤں سے تقریباً 35 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا شادی شدہ بیٹا، جس کے پانچ بچے ہیں، نے اپنے چھوٹے سے کریانہ اسٹور کے لیے 60 ہزار روپے (214 امریکی ڈالر) کا قرضہ لیا۔ یہ دکان ایک چھوٹی سی کیمین میں قائم کی گئی تھی۔ بیٹے نے ایک پرانا کمپیوٹر بھی خریدا تھا، جس پر وہ گانے ڈاؤن لوڈ کر کے کسٹمرز کی USB میں کاپی کرتا تھا۔ یہ قرض سالانہ 30 فیصد سود پر لیا گیا تھا۔

کچھ عرصے بعد سونی کا بیٹا گاؤں کی ایک عورت کے ساتھ رومانوی تعلق میں بندھ گیا جس کے نتیجے میں سونی کے پورے خاندان کو گاؤں سے نکال دیا گیا۔ سونی، ان کا بیٹا، بہو اور پانچ بچے، سب کو اپنا گاؤں چھوڑ کر سیل گام گاؤں میں سونی کی بہن کے گھر پناہ لینی پڑی۔ کورونا کے دوران دکان کا کاروبار پہلے ہی خراب ہو چکا تھا، بعد ازاں مکمل طور پر بند ہو گیا۔ سود کی ادائیگی نہ ہونے کے باعث خاندان کو اپنا سارا قیمتی سامان بیچنا پڑا۔ آخر کار سونی کو اپنے امر و بھیل والے پرانے گھر کی چھت میں لگے لوہے کی سلاخوں کو بھی فروخت کرنا پڑا۔

سونی اور ان کا بیٹا اب کھیت مزدور کے طور پر کام کر رہے تھے تاکہ قرض ادا کر سکیں مگر کام اور مزدوری اتنی کم ملتی تھی کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی بھی ٹھیک سے پوری نہیں کر پارہے تھے اور حتیٰ کہ خوراک کا انتظام بھی مشکل سے ہی ہو پارہا تھا۔ قرض کی عدم ادائیگی پر بینک مسلسل خاندان کو ہراساں بھی کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک مولوی نے سونی کے بیٹے سے رابطہ کر کے اسے قرض کی رقم ادا کرنے کے بدلے اسلام قبول کرنے کی پیش کش کی۔ سونی کے بیٹے نے اس پورے معاملے میں مشورہ کے لیے ایک غیر سرکاری ادارے سے رابطہ کیا اور مدد چاہی۔ ادارے نے سونی کے بیٹے کا قرض ادا کیا اور بینک کے ساتھ بات چیت کر کے سود معاف کروا دیا۔ سوہنی کے خاندان کے مطابق سیل گام اور دیگر قریبی علاقوں میں اور بھی کئی ہندو خاندانوں کو نقد رقم اور رہائش کی لالچ دیکر مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیے جانے کی پرزور کوششیں کی جا رہی ہیں۔

1. International Monetary Fund: Evaluation of Prolonged Use of IMF Resources, Evaluation Report, 2002, <https://www.imf.org/external/pubs/ft/epui/2002/pdf/report.pdf>.
2. Tahir Siddiqui. "Division of Karachi into 26 towns, 233 UCs notified." DAWN, January 8, 2022. Accessed from <https://www.dawn.com/news/1668180>
3. KATI. "Korangi Association of Trade and Industry." Accessed from <https://kati.pk>
4. IMF. "Letter of Intent." IMF, March 18, 2001. Accessed from <https://www.imf.org/external/np/loi/2001/pak/01/>
5. Asian Development Bank. "ADB Validity Report: Pakistan Energy Sector Restructuring Program." ADB, May 2009. Accessed from <https://www.adb.org/sites/default/files/evaluation-document/35637/files/in161-09.pdf>
6. Syed Nazre Hyder. "IMF Stand-by Arrangement for Pakistan and its Inconclusive End – What went Wrong?" Sustainable Development Policy Institute, 2012. Accessed from <https://dataspace.princeton.edu/handle/88435/dsp01ng451k754>.
7. Afia Malik. "In power projects: history, policy and politics." PIDE, P&R Vol. 2, Issue 5, Policy and Research, 2021. Accessed from <https://file.pide.org.pk/pdfpideresearch/par-vol2i5-03-in-power-projects-history-policy-and-politics.pdf>
8. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default." Express Tribune, January 21, 2023. Accessed from <https://tribune.com.pk/story/2397052/a-debt-trap-spanning-75-years-pakistans-journey-towards-a-sovereign-default>.
9. Jeffrey Franks. "Pakistan: the realities of economic reform." IMF Blog, December 19, 2013. Accessed from <https://www.imf.org/en/Blogs/Articles/2013/12/19/pakistan-the-realities-of-economic-reform>.
10. Safiya Aftab. "What is pushing tax reform in Pakistan?" Norwegian Peacebuilding Resource Centre (NOREF), January 2014. Accessed from <https://www.files.ethz.ch/isn/177487/a3fd0b9ea58bbc2140074123dc3c1344.pdf>
11. Ibid, p.2
12. Poverty Alleviation: Human Resource Development and Achieving MDGs," in 11th Five Year Plans Information Management (Islamabad: Planning Commission, Ministry of Planning, Development and Reform, Government of Pakistan, n.d.), p. 67–82. Available at: <https://www.pc.gov.pk/uploads/plans/Ch8-Poverty-alleviation1.pdf>
13. Asim Bashir Khan. "Debt taxes and inflation: highlights from the last 10-years of Pakistan's economy." DAWN, April 26, 2018. Accessed from <https://www.dawn.com/news/1403998>
14. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
15. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
16. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
17. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
18. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
19. Shahbaz Rana. "A debt-trap spanning 75 years: Pakistan's journey towards a sovereign default."
20. S. Akbar Zaidi. "Pakistan submits to the IMF again." East Asia Forum, June 11, 2019. Accessed from <https://eastasiaforum.org/2019/06/11/pakistan-submits-to-the-imf-again/>
21. Nyshka Chandran. "Whether Pakistan accepts money from the IMF or China, its economy is still headed for trouble." August 9, 2018. Accessed from <https://www.cnbc.com/2018/08/09/pakistan-looks-to-imf-or-china-for-bailout.html>
22. IMF. "Press Release No.: 19/264 IMF Executive Board approves US\$6 billion 39-month EFF arrangement." IMF, July 3, 2019. Accessed from <https://www.imf.org/en/News/Articles/2019/07/03/pr19264-pakistan-imf-executive-board-approves-39-month-eff-arrangement>
23. International Monetary Fund. "Pakistan: Request for a stand-by arrangement – Press release; staff report; staff statement; and statement by the Executive Director for Pakistan." IMF, July 2023. Accessed from https://www.finance.gov.pk/mefp/IMF_21072023.pdf
24. Express Tribune. "IMF denies it plans to ask Pakistan to raise taxes on salaried class." Express Tribune, December 15, 2023. Access from <https://tribune.com.pk/story/2450123/imf-denies-it-plans-to-ask-pakistan-to-raise-taxes-on-salaried-class#>
25. Roots for Equity. "In a Nutshell." Roots for Equity, August 2023. Accessed from <http://rootsforequity.org/wp-content/uploads/2023/09/Issue-II-August-23-In-a-Nutshell-1.pdf>

26. Roots for Equity. "In a Nutshell." Roots for Equity, July 2023. Accessed from <http://rootsforequity.org/wp-content/uploads/2023/09/In-a-nutshell-July-2023-2.pdf>
27. Roots for Equity. "In a Nutshell." Roots for Equity, July 2023.
28. Roots for Equity. "In a Nutshell." Roots for Equity, August 2023. Accessed from <http://rootsforequity.org/wp-content/uploads/2023/09/Issue-II-August-23-In-a-Nutshell-1.pdf>
29. IISD. "Pakistan terminates 23 BITs." Investment Treaty News, October 7, 2021. Accessed from <https://www.iisd.org/itn/en/2021/10/07/pakistan-terminates-23-bits/#:~:text=Pakistan%20is%20currently%20facing%2010,a%20claim%20against%20the%20state.>
30. Bilaterals.org. "Pakistan agrees to new ISDSS provisions, despite previous policy to terminate ISDS agreements." AFTINET, January 23, 2024. Accessed from <https://www.bilaterals.org/?pakistan-agrees-to-new-isds&lang=es>
31. Government of Pakistan, Finance Division. "Pakistan Economic Survey: Inflation." Pakistan Economic Survey 2022-23, p. 117. Accessed from https://www.finance.gov.pk/survey/chapters_23/07_Inflation.pdf
32. Shahbaz Rana. "95m Pakistanis live in poverty: World Bank." Express Tribune, September 23, 2023. Accessed from <https://tribune.com.pk/story/2437352/95m-pakistanis-live-in-poverty-world-bank>
33. IMF Communications Department, 'IMF Executive Board Approves US\$3 billion Stand-By Arrangement for Pakistan', International Monetary Fund, 23 July 2023, <https://www.imf.org/en/News/Articles/2023/07/12/pr23261-pakistan-imf-exec-board-approves-us3bil-sba>.
34. Trading Economics. "Pakistan Imports of Cotton". Trading Economics, Accessed from <https://tradingeconomics.com/pakistan/imports/cotton>.
35. National Commission on the Status of Women, and UN Women. "National Report on the Status of Women in Pakistan, 2023: A summary." UN Women, 2023. Accessed from https://pakistan.unwomen.org/sites/default/files/2023-07/summary_nrswnl_final.pdf
36. Relief Web "IOM Pakistan, Situation Report No.2: Pakistan Floods Response – December 31, 2022." Geneva: International Organization for Migration. Accessed from <https://reliefweb.int/report/pakistan/iom-pakistan-situation-report-no-2-pakistan-floods-response-december-31-2022>.
37. Bilquis Tahira. "New IMF-Pakistan agreement likely to have adverse impact on women." Bretton Woods Project, December 9, 2021. Accessed from <https://www.brettonwoodsproject.org/2021/12/new-imf-pakistan-agreement-likely-to-have-adverse-impact-on-women/>
38. International Monetary Fund. www.imf.org/en/Publications/CR/Issues/2022/02/04/Pakistan-2021-Article-IV-Consultation-Sixth-Review-Under-the-Extended-Arrangement-Under-the-512715 (accessed 27 April 2023).
39. The Graduate Institute of Development Studies, Published in [brettonwoodsproject.org](https://www.brettonwoodsproject.org) on December 09, 2021, <https://www.gids.org.pk/new-imf-pakistan-agreement-likely-to-have-adverse-impact-on-women/>.
40. Roots for Equity. "Unacknowledged treasures: the home-based women labor of Pakistan." UN Women and the Norwegian Embassy, 2011. Accessed from <https://rootsforequity.noblogs.org/files/2014/09/Unacknowledged-Treasure.pdf>
41. Haroon Janjua. "Pakistan: millions of textile workers lose jobs amid crisis." DW, January 17, 2023. Accessed from <https://www.dw.com/en/pakistan-millions-of-textile-workers-lose-jobs-amid-crisis/a-64420339#:~:text=About%207%20million%20workers%20have,of%20collapse%2C%20industry%20representatives%20warn.&text=For%20Ashraf%20Ali%2C%20a%20textile,come%20crashing%20down%20around%20him.>
42. Parveen Latif Ansari. "Pakistan's textile industry is in crisis – and women are bearing the brunt of its decline." The Guardian, February 1, 2023. Accessed from <https://www.theguardian.com/global-development/2023/feb/01/pakistan-textile-industry-crisis-women>
43. National Commission on the Status of Women, and UN Women. "National Report on the Status of Women in Pakistan, 2023: A summary."
44. Roots for Equity. "Unacknowledged treasures: the home-based women labor of Pakistan." UN Women and the Norwegian Embassy, 2011, p 108. Accessed from <https://rootsforequity.noblogs.org/files/2014/09/Unacknowledged-Treasure.pdf>
45. Khaleeq Kiani. "Govt increases petrol price by Rs10 per litre." DAWN, April 1, 2024.
46. Khaleeq Kiani. "Up to Rs8.50 hike in fuel prices likely." DAWN, April 15, 2024.

Mobilizing Communities for an Equitable World

ROOTS FOR EQUITY

Roots for Equity

A-1, 1st Floor, Block 2, Gulshan-e-Iqbal, Karachi, Pakistan

Phone: +9221 34813320

Email: roots@rootsforequity.org

About Us

Roots for Equity was formed in 1997 and formally registered in 2000. The organization works with the most vulnerable, marginalized communities that include small and landless farmers, women and religious minorities in the rural and urban sector. The inequities in society are a result of the oppression and exploitative forces of feudalism, imperialist corporate hegemony often termed as globalization, and patriarchy.

We believe that a democratic base is essential for the social and economic development of the country. This is not possible without mobilization of communities themselves; no doubt only socially conscious and politically active communities can demand and achieve social justice. Roots remains committed to being an active part of communities' struggle to achieve political, social, environmental and economic justice.

Our Mission

Our mission is to strengthen communities and movements for attaining political, economic, social and environmental justice.

Our Vision

Our vision is a genuinely democratic society with its people free from inequities, marginalization and exploitation.

Our Objectives

- i) Organizing and mobilizing grass root communities and movements for attaining basic rights;
- ii) Action research in collaboration with impacted vulnerable communities on issues and impacts of globalization, patriarchy, and feudalism;
- iii) Capacity building of grass root leaders and creating a grass roots knowledge base for attaining social justice;
- iv) Engaging with people's organizations and movements to amplify the voices of the most marginalized sectors of our society, locally, nationally and internationally.



Website: <http://rootsforequity.org/>

Blog: <https://rootsforequity.noblogs.org/>

Twitter: <https://twitter.com/RootsEquity>

Instagram: <https://www.instagram.com/rootsforequity/>